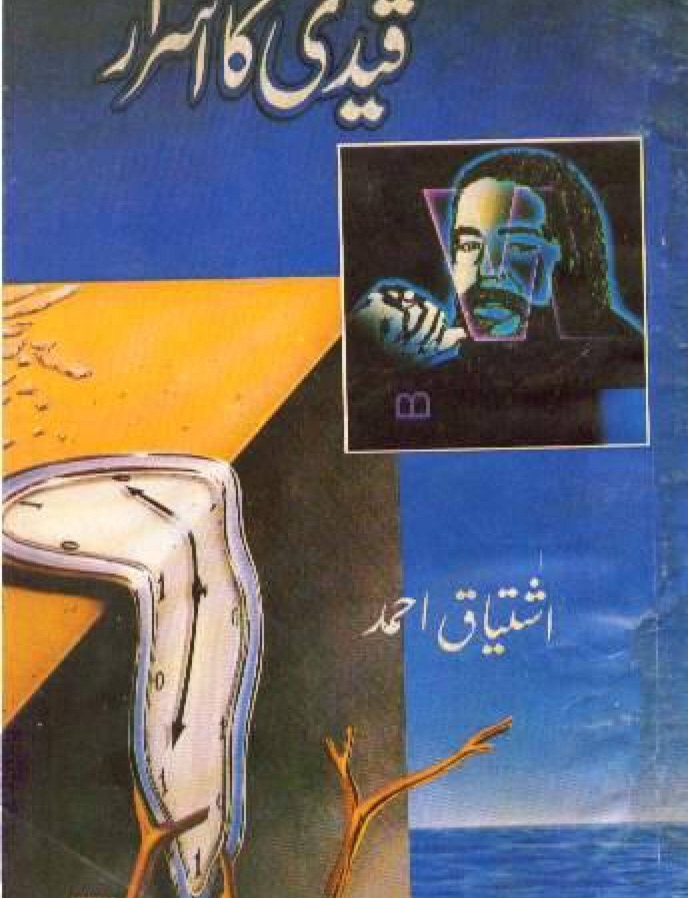
قیدی کا اسرار
اشتیاق احمد

ایک اور آواز

محمود نے چائے کا کپ اُٹھایا اور فرش پر پٹخ دیا :

"مسٹر! یہ آپ نے کیا کیا ــ آپ جانتے ہیں، ہمارے ہوٹل کے برتن کس قدر قیمتی ہیں:" ایک بیرا تیزی سے اس کی طرف لپکا ــ

"اس ہوٹل کا نام اوکو ہارا ہے ــ یہی بات ہے نا؟" محمود نے جلدی سے کہا۔

"یس:" بیرا بولا۔

"یہ انشارجہ کے شہر مار فوک کا سب سے بڑا ہوٹل ہے، ہے نا؟" فاروق بولا۔

"یس:" بیرے نے فوراً کہا۔

"یہ سب سے مہنگا بھی ہے؟"

"اس میں کیا شک ہے:"

"یہ ــ یہ کیا ہے؟" اس نے چینی کے ایک اور برتن کو اُٹھا

کر کہا۔

"یہ ساس پین ہے۔"

"یہ لو۔" اس نے کہا اور اس برتن کو بھی پٹخ دیا۔

اب تو سارا ہال ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ کیا کیا۔ ان برتنوں کا بل آپ کو دینا پڑے گا۔"

"اگر یہ بات ہے تو یہ لو۔" محمود اور فاروق نے مل کر پوری میز الٹ دی۔ تمام برتن چھن چھن چھناک کی آوازوں سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اب دوسرے بیرے بھی ان کی طرف دوڑے۔

"اے! تم لوگ پاگل تو نہیں ہو۔"

یہ تمام الفاظ انگریزی میں کہے جا رہے تھے اور بیروں کے چہرے اب غصے سے سرخ ہو چکے تھے۔ ایسے میں فرزانہ ایک دوسری میز کی طرف سرک گئی۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی، کیونکہ اب تک توڑ پھوڑ کے کام میں اس نے کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

"نہیں! ہم پاگل نہیں ہیں۔ ہوش میں ہیں۔"

"تو پھر یہ برتن کس خوشی میں توڑ رہے ہو؟"

"تم برتنوں کی بات کرتے ہو۔ ابھی تو ہم اس ہوٹل کی نہ جانے کیا کیا چیزیں توڑیں گے۔ یہ دیکھو۔ چھت

پر لگا ہوا فانوس نیچے آنے والا ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی فرزانہ نے ایک وزنی برتن اٹھا کر فانوس پر دے مارا۔ اب فانوس کے شیشے نیچے گر کر آواز پیدا کرتے چلے گئے۔

ہوٹل کے ہال میں ان گنت چیخیں بلند ہوئیں۔

"یہ لوگ پاگل ہیں۔ انہیں قانون کے حوالے کیا جائے۔ آخر اب تک فون کیوں نہیں کیا گیا۔" ایک آدمی نے چلا کر کہا۔

"اوہ!"

کاؤنٹر کلرک نے فوراً کہا اور فون کرنے لگا۔ محمود نے وہیں سے ایک ایش ٹرے اٹھائی اور اس کے سر کا نشانہ لے کر چھوڑ دی۔ ایش ٹرے تیر کی طرح گئی اور اس کی پیشانی سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی، ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ بیٹھتا چلا گیا۔

"خبردار! اب اگر کسی نے فون کرنے کی کوشش کی تو ایش ٹرے کی بجائے گولی اس کی پیشانی کے پار ہو گی۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی فاروق کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

"ہائیں! تم نے تو پستول تک نکال لیا۔"

"تو اور کیا کرتا ۔ جیب سے رس ملائی نکالتا۔"

"لیکن یار ان لوگوں کو بتا نہ دینا ۔ کہ یہ بالکل نقلی ہے۔" محمود ہنسا۔

"حد ہو گئی ۔ خود بتا دیا ۔ اور مجھے روک رہے ہو۔" فاروق نے جل کر کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں ۔ میرے ہاتھ میں تو اصلی والا ہے نا۔" فرزانہ نے کہا اور اپنا ہاتھ لہرایا ۔ اس کے ہاتھ میں پستول کی بجائے ایک پلاسٹک کا کلپ تھا ۔

اس عالم میں بھی لوگ ہنسنے لگے:

"آپ لوگ کس بات پر ہنس رہے ہیں ۔ خبردار ۔ پہلے مجھے بتاؤ، پھر ہنسنا، ورنہ میں ہنسی بند کرنا بھی جانتی ہوں۔"

"وہ کیسے ۔ ذرا بند کر کے دکھانا ۔ بہت دن ہو گئے ہم نے ہنسی کو بند نہیں کیا ۔ ویسے بھی میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بند ہنسی کیسی لگتی ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"ابھی لو ۔ وہ دیکھو ۔ وہ بوڑھا انگریز ۔ پوری بتیسی نکالے ہنس رہا ہے نا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک چمچ اڑتا ہوا گیا اور اس کی ناک پر لگا ۔ اس کی ہنسی پر لگا کر اس طرح غائب ہو گئی جیسے کبھی اس کے چہرے پر آئی ہی نہیں تھی ۔ باقی لوگوں نے بھی فوراً اپنی اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ لیا ۔

"ارے! یہ سب کیا ہے؟" ایک بھاری بھرکم آواز گونج اٹھی ۔

"مسٹر جیری آ گئے۔" ایک بیرا چلایا۔

"اور یہ مسٹر جیری کون ہیں؟"

"ہوٹل کے مینجر ۔ اور باکسنگ کے چیمپین ۔ جوڈو کراٹے کے ماہر ۔ مارشل آرٹ کے بہترین کھلاڑی ۔ کنگفو آرٹ کا اوّل انعام جیتنے والے ۔ یہ تم لوگوں کو بتائیں گے۔"

"کیا بتائیں گے ۔ لڑائی کے ان سب طریقوں پر لیکچر دیں گے کیا؟"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔"

"وہ تو جب معلوم ہو گا ۔ ہو گا ۔ پہلے تو آپ ذرا یہ دیکھ لیں۔" یہ کہتے ہوئے فرزانہ نے ایک اور میز الٹ دی ۔ اس کے بھی تمام برتن ٹوٹ گئے ۔ اس میز پر بیٹھے ہوئے لوگ چیخ چلا کر دور ہٹ گئے ۔ یہ دیکھ کر مینجر چلایا:

"ایک ایک برتن کی قیمت وصول کی جائے گی۔"

"ہو گی تو وصول کریں گے نا — ہم تو پہلے ہی لٹ چکے ہیں — کسی نے ہمارے کمرے کا صفایا کر دیا — سب کچھ لے کر چلتا بنا — ہمارے ٹریولر چیک تک اڑا کر لے گیا — حالانکہ وہ چیک اس کے کسی کام نہیں آئیں گے۔"

"تو کیا تم اس کا انتقام ہم سے لے رہے ہو؟"

"ہاں بالکل — اور ہم کیا کریں — اب ہم اپنے ملک کس طرح جائیں گے۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں — کہ تم توڑ پھوڑ مچانا شروع کر دو — تم لوگوں سے مدد کے لیے کہہ سکتے ہو۔"

"ہمیں بھیک مانگنا نہیں آتا — یہ لو — ایک اور برتن گیا۔" فرزاد نے ایک جگ اٹھا کر فرش پر چھوڑ دیا۔

"خبردار! اب میں اور نقصان برداشت نہیں کروں گا۔"

"تو پھر — آپ کیا کریں گے؟"

"میں تم لوگوں کا قیمہ بناؤں گا — اور اس قیمے کو برگروں میں بھروں گا — سو ڈالر کا ایک برگر بیچوں گا — اس طرح میرا نقصان پورا ہو جائے گا۔" وہ شیطانی ہنسی ہنسا۔

"ہائیں! تو کیا تم انسانوں کا گوشت انسانوں کو کھلا

دیتے ہو؟"

"آج تک تو ایسا نہیں کیا، لیکن اب شاید کرنا پڑے گا — آخر تمہارا گوشت کس کام آئے گا۔"

"کیا تم ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو مسٹر؟" محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نہیں — لیکن تم لوگوں کی سزا بھی تو کچھ ہونی چاہیے۔ ارے کسی نے پولیس کو فون کیا یا نہیں؟"

"ہمارے ہاتھوں میں پستول ہیں — تم یہ بھول رہے ہو۔"

"ڈرنے کی ضرورت نہیں مینجر — پستول ان میں سے صرف ایک کے ہاتھ میں ہے — لڑکی کے ہاتھ میں صرف کلپ ہے اور دوسرے لڑکے نے اپنا پن پستول کی طرح پکڑ رکھا ہے — یہ پستول بالکل نقلی ہے۔" کسی نے کہا۔

"تب تو یہ ضرور مسخرے ہیں۔"

"ہاں! مسخرے ہیں — لیکن ذرا اور قسم کے — یہ لو۔" محمود نے کہا اور ایک اور میز الٹ دی۔

"اب میں برداشت نہیں کر سکتا — پولیس تو پتا نہیں، کب آئے گی — ان تینوں کو پکڑ لو۔"

"فون تو اب تک کسی نے ضرور کر دیا ہو گا — اور..."

عین اس وقت پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے:

"پولیس آ گئی۔"

"تو کیا ہوا۔ پولیس نے اگر ہماری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ہم انھیں دن میں تارے دکھا دیں گے۔ دن میں تارے دکھانے کا مطلب جانتے ہیں آپ لوگ؟"

"پولیس اب تم لوگوں کی چٹنی بنائے گی۔ فکر نہ کرو۔"

"فکر کریں آپ لوگ۔ ہماری بلا کرتی ہے۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"بلا صرف تمھاری فکر کرے گی۔"

"اب ان لوگوں کو جلد از جلد بتا دینا چاہیے کہ ہمارے پستول نقلی نہیں۔ بلکہ ..." محمود کہتے کہتے رک گیا۔

"بلکہ کیا؟" مینجر بولا۔

"بلکہ بالکل اصلی ہیں۔ یہ دیکھو۔ تمھارے کان کی لو گئی۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی محمود نے فائر کر دیا۔ مینجر کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ لوگوں نے اس کے کان کی لو سے خون ایک دھار کی صورت میں نکلتے دیکھا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ اس قدر زبردست نشانہ شاید انھوں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

"حیرت ہے۔ ایسا پختہ نشانہ"

"یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟" پولیس آفیسر کی آواز پورے ہال میں گونج کر رہ گئی۔ سب لوگ اس کی طرف مڑے اور پھر جلدی جلدی اسے تفصیل سنائی جانے لگی۔ اس کے پیچھے دس کے قریب کانسٹیبل بھی تھے۔

"تب تو یہ خطرناک مجرم ہیں۔ انھیں فوراً گرفتار کر لینا چاہیے۔ اے تم لوگ ہاتھ اوپر اٹھا دو اور یہ پستول نیچے گرا دو۔"

"صرف پستول نیچے گرانے سے کام نہیں بنے گا۔ انسپکٹر صاحب۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ کلپ بھی ذرا دیکھ لیں۔ آپ کی پیشانی پر میں ایک ہلکا سا نشان بنانے لگا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کی پیشانی میں ایک باریک سا سوراخ نظر آیا، ساتھ ہی وہ تڑپے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

"ارے! یہ کیا ہوا؟"

"بس صرف بے ہوش ہو گئے ہیں ذرا۔ ابھی ہوش میں آ کر ہمارا شکریہ ادا کریں گے۔" فاروق بولا۔

"شکریہ اور انسپکٹر صاحب ادا کریں گے۔ وہ بھی تم لوگوں کا۔"

"ہاں بالکل! اس لیے کہ اگر ہم چاہتے۔ تو پیشانی کا یہ سوراخ اتنا بڑا بھی بنا سکتے تھے کہ اس میں سے خون کی بڑی سی دھار نکلنے لگتی۔"

"یہ ضرور پاگل ہیں اور ہم سب کو بھی پاگل کر دیں گے۔" مینجر نے چلا کر کہا۔

"ہمارا ایسا کوئی ارادہ تو نہیں، لیکن اگر آپ لوگ پاگل ہونا پسند کرتے ہیں تو ہم کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ آپ خوشی سے پاگل ہو جائیں۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

کانسٹیبل ان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ فرزانہ نے اپنے کلپ میں ایک سوئی دبا دی۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور اگلے دو کانسٹیبل تڑ سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ اب تو لوگوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ان تینوں کو اس طرح گھورنے لگے، جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہوں۔

"اب تک ہم رعایت کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں نے ہماری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ہم ذرا سختی سے پیش آئیں گے اور ہماری ذرا سی سختی آپ لوگوں کے لیے بہت سخت ثابت ہو گی۔ تم لوگ

انسپکٹر اور مینجر کا حال دیکھ ہی چکے ہو۔" محمود نے پہلی بار سرد آواز میں کہا۔

لوگوں نے حیرت بھری نظروں سے انھیں دیکھا، جیسے کہ رہے ہوں:

"ابھی ابھی تو یہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب انھیں کیا ہو گیا۔"

باقی کانسٹیبل ٹھٹک کر رک گئے۔ اپنے انسپکٹر کا انجام تو وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ اب دو کانسٹیبلوں کو گرتے دیکھ لیا تھا اور اس سے بھی پہلے مینجر کے کان کی لو اڑ چکی تھی۔ یہ تمام باتیں ان کے لیے حیرت انگیز تھیں:

"آخر تم لوگ کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو؟" مینجر بولا۔

"اس پورے شہر کا نظام درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہا۔ پورے شہر کا نظام درہم برہم کر دیں گے، دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"ہاں چل گیا ہے۔ روک لیں ہمیں۔ اگر روک نہ سکے۔ تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔ آؤ بھئی۔ اب ذرا اس شہر کو الٹ پلٹ کریں۔ ہوٹل والوں کو تو ایک نمونہ دکھانا تھا۔"

تینوں باہر کے دروازے کی طرف مڑے۔ اسی

وقت ایک کانسٹیبل نے محمود پر چھلانگ لگائی۔ اپنی طرف سے اس نے محمود کو بالکل بے دھیان محسوس کر کے چھلانگ لگائی تھی اور شاید اس کا اندازہ تھا کہ محمود کو ساتھ لیے فرش پر گرے گا — اس طرح دوسرے کانسٹیبل اس کی مدد کریں گے اور محمود قابو میں آجائے گا، لیکن محمود بے دھیان نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ ذرا سا رک گیا — نتیجہ یہ کہ وہ خود فرش پر منہ کے بل گرا۔ ایسے میں ایک اور آواز سنائی دی —

ہنگامہ

"بہت خوب! بہت دلچسپ — تم پر کوئی الزام نہیں — تم نے ہوٹل کا کوئی نقصان نہیں — میرے، میرے گدھے ہیں — اور یہ مینیجر اُلّو — تم وہ شاہکار ہو — جس کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔"

آنے والے شخص نے تالیاں بجا کر یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

"آپ کی تعریف جناب" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"میری کیا تعریف — تعریف تو تمہاری ہونی چاہیے — آؤ میرے ساتھ — ہم بیٹھ کر بات کریں گے — پولیس والے جا سکتے ہیں — ان کے خلاف کوئی الزام نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے — یہاں اتنا کچھ ہوا ہے۔"

"یہ میرا ہوٹل ہے — میں نقصان کو پورا کروں گا — کسی گاہک کا کوئی نقصان ہوا ہے تو میں پورا کروں گا — مینیجر — جس کی یہ شکایت ہو — اس کے مطابق

معاوضہ ادا کر دو۔"

"یس سر" مینیجر بولا۔

"آپ کی تعریف؟"

"پھر وہی تعریف — تعریف گئی بھاڑ میں — اب تک میری جتنی تعریف ہوئی ہے — سب کی سب بالکل بے کار کی گئی ہے — تعریف کے حق دار تو تم ہو۔"

"آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"میرے ساتھ آؤ گے تو بات ہو گی نا — یہاں تو بتانے سے رہا۔"

"نہیں جناب! ہمیں تو بس شہر میں توڑ پھوڑ مچانا ہے۔"

"اگر تم میرے ساتھ نہ چلے تو پھر انجام بہت برا ہو گا۔" ہوٹل کے مالک کو یک دم غصہ آ گیا

"یہ کیا بات ہوئی — ابھی ابھی تو ہماری تعریف ہو رہی تھی — اور اب ..."

"اگر میری بات نہیں مانو گے تو تعریف کیا — اپنی جان بچانا مشکل ہو جائے گا تمہارے لیے۔"

"ارے میاں جاؤ — بہت دیکھے ہیں تم جیسے۔" فاروق نے ہنس کر کہا۔

"اچھا — یہ بات ہے — تو تم اگلے کمرے میں چل کر میری بات نہیں سنو گے؟"

"نہیں — اس لیے کہ ہم جان چکے ہیں — آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہا — جان چکے ہو — اچھا ذرا بتانا تو۔"

"آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ ہم آپ کے لیے کام کریں۔"

"اوہ! تم لوگ تو سچ مچ بھانپ گئے۔"

"وہ اس لیے کہ جھوٹ موٹ بھانپنے کی ہمیں عادت نہیں ہے۔"

"تم لوگ ہو کیا بلا؟"

"خوب صورت بلا — بلکہ ہم تین ہیں — لہٰذا بلائیں کہنا مناسب ہو گا — آپ کو گرامر آتی ہے نا۔"

"نہیں — ہاں — تم کام کی بات کرو۔" وہ جھلا اٹھا۔

"ارے! تو گرامر گویا کام کی بات ہی نہیں — استاد صاحبان ہمیں بلا وجہ مارتے رہتے ہیں — حیرت ہے۔"

"یہ یوں نہیں مانیں گے سر — بہت ٹیڑھی چیز ہیں۔" مینیجر نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں محسوس کر چکا ہوں — لیکن یہ مجھے پسند اس قدر آئے ہیں کہ کیا بتاؤں — خیر میں آخری بار ان سے پوچھتا ہوں — میرے لیے کام کرو گے یا نہیں؟"

"نہیں — صرف اور صرف اپنے لیے کام کریں گے۔"

"بہت خوب! اب کروک کو بلانا ہی ہو گا۔"

"کروک — یہ کن حضرت کا نام ہے؟"

"ابھی معلوم ہو جائے گا — مینجر — گھنٹی بجاؤ — کروک والی گھنٹی۔"

مینجر دوڑ کر کاؤنٹر پر گیا اور ایک گھنٹی بجا دی — صرف ایک منٹ بعد ہال میں پہاڑ نما ایک آدمی داخل ہوا — اس پر نظر پڑتے ہی ہال میں موجود تمام لوگ سہم گئے۔

"کروک — کروک" وہ منہ ہی منہ میں بولے۔

"ہاں دوستو — یہ کروک ہے — اس کے کمالات آپ لوگ پہلے بھی دیکھتے رہے ہیں — ہوٹل میں گڑبڑ کرنے والوں کو یہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دینے کا ماہر ہے — لیکن آج یہ ان تینوں کو اٹھا کر باہر نہیں پھینکے گا — بلکہ یہیں رکھ کر ان کا آملیٹ تیار کرے گا۔"

"یہ ہوٹل بھی عجیب ہے — تھوڑی دیر پہلے ہمارے گوشت کے قیمے سے برگر تیار کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا — اور اب ہمارا آملیٹ تیار کیا جائے گا — گویا یہاں لوگوں کو یہی کچھ کھلایا جاتا ہے۔"

"خاموش — کروک — ان کی مرمت کرنی ہے — اس طرح کہ یہ بھاگ بھی نہ سکیں۔"

"تو پھر ہوٹل کے دروازے بند کرا دو باس — میں ان کی طرف دھیان رکھوں گا یا دروازوں کی طرف۔"

"چلو یونہی سہی۔"

"ہوٹل کے گاہکوں کے لیے یہ مقابلہ بالکل مفت دکھایا جائے گا — لیکن جو باہر سے آنا چاہیں — ان کے لیے ٹکٹ لگا دیں — باہر بھی بہت سے لوگ موجود ہیں — وہ بھی ہال کی دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ دلچسپ مقابلہ دیکھ سکیں گے۔"

"بہت خوب! یہ پروگرام بہت مزے دار رہے گا۔" یہ کہہ کر ہوٹل کا مالک دروازے پر پہنچ گیا۔

"آپ لوگ ان تینوں کو تو دیکھ ہی چکے ہیں — اب میرا ملازم کروک ان سے مقابلہ کرے گا — آپ لوگ اندر آ کر یہ مقابلہ دیکھ سکیں گے — باہر رہ کر نہیں — لہٰذا پانچ ڈالر فی آدمی ٹکٹ ہو گا — جو اندر آنا چاہیں — پانچ پانچ ڈالر دیتے جائیں۔"

"یہ ناانصافی ہو گی۔" محمود نے ایسے میں بلند آواز میں کہا۔

"کیا مطلب — کیسی ناانصافی؟"

"لڑیں گے ہم ۔ چوٹیں ہم کھائیں گے ۔ اور رقم صرف آپ کو ملے گی۔"

"اور جو میرے ہوٹل کا نقصان ہوگا۔"

"آپ اپنا نقصان ضرور پورا کریں، لیکن جیتنے والے اور ہارنے والے کے لیے بھی رقم کا اعلان کریں۔"

"بالکل ٹھیک ۔ بالکل ٹھیک ۔ یہ ان کا حق بنتا ہے۔"

"تو پھر جتنے آدمی باہر سے آئیں، ان سے ہونے والی آمدنی کا چوتھا حصہ جیتنے والے کو ملے گا اور آٹھواں حصہ ہارنے والے کو۔"

"چلیے ٹھیک ہے۔"

اور پھر لوگ دھڑا دھڑ اندر آنے لگے ۔ اس وقت تک ان تینوں کی اس ہنگامہ آرائی کی خبر آس پاس جنگل کی آگ کی طرح پھیل ہی چکی تھی ۔ دس منٹ تک لوگ نہایت تیزی سے اندر آتے رہے اور ہوٹل کا مالک نوٹ پکڑتے پکڑتے تھک گیا ۔ اب نوٹ ایک بیرا اپنی جھولی میں جمع کرتا جا رہا تھا ۔ آخر اندر ہال بھر گیا ۔ تل دھرنے کی جگہ بھی نہ رہ گئی ۔ لیکن باہر لوگوں کا رش اب تک جوں کا توں تھا ۔ مجبوراً ہوٹل کے مالک کو دروازے بند کروانا پڑے ۔ لیکن ایسے میں اس نے کہا تھا:

"کاش! میں نے ہوٹل کا ہال چار گنا بڑا بنوایا ہوتا۔"

اور پھر مقابلہ شروع ہوا:

"ترکیب نمبر تیرہ۔" محمود نے شروع میں ہی ان سے کہہ دیا اور یہ انھوں نے اردو میں کہا۔

"یہ کیا کہا اس نے؟" کروک نے اپنے مالک کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمھیں اس سے کیا ۔ تم اپنے فن کا مظاہرہ کرو اور سن لو کروک ۔ اگر تم ان سے ہارے تو پھر تمھیں اس ہوٹل سے باہر نکلنا پڑے گا ۔ پھر تم میری ملازمت میں نہیں رہ سکو گے۔"

"ٹھیک ہے باس ۔ لیکن مقابلہ کیا ہے ۔ پہلے یہ تو وضاحت کر دیں۔"

"تمھیں ان تینوں کو بے کار کرکے فرش پر گرا دینا ہے ۔ اس حد تک بے کار..... کہ یہ اٹھ نہ سکیں پھر ہم انھیں قانون کے حوالے کر دیں گے۔"

"بہت خوب! گویا ہمیں بھی کروک کو اس حد تک بے کار کرنا پڑے گا ۔ کہ یہ اٹھ نہ سکے۔"

"ہاں! لیکن نہ تم اور نہ یہ ۔ ایک دوسرے کو جان سے نہیں ماریں گے۔"

"چلیے منظور ہے۔"

اور پھر مقابلہ شروع ہوا — کروک واقعی اپنے فن میں ماہر تھا — اس میں بلا کی تیزی تھی — ڈیل ڈول بہت زیادہ ہونے کے باوجود اس کی پھرتی قابلِ تعریف تھی — لیکن اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کا مقابلہ بھی معمولی لوگوں سے نہیں تھا — وہ بھی آئے دن اس قسم کے کھیل کھیلتے رہتے تھے — اب وہ تین حصوں میں بٹے ہوئے تھے — تین مختلف جگہوں پر کھڑے تھے اور کروک کے حملے کا انتظار کر رہے تھے، ادھر کروک کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، لہذا اس نے سوچے سمجھے بغیر پہلے محمود پر وار کیا — محمود اس کے سامنے تھا، لیکن جونہی وہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا — فرزانہ نے پیچھے سے اس کی کمر پر سر کی ٹکر رسید کر دی — وہ بہت زور سے لڑکھڑایا، لیکن گرنے سے بچ گیا، اگر فوراً ہی فاروق دائیں طرف سے سر کی ٹکر نہ دے مارتا — یہ دو ٹکریں اسے لے کر بیٹھ گئی تھیں — وہ دھڑام سے گرا — سامنے محمود بالکل تیار تھا — اس نے اپنے جوتے کی ایک ٹھوکر اس کے سر میں رسید کی اور یہ ٹھوکر اس قدر زبردست تھی کہ حقیقتاً

اسے دن میں تارے نظر آ گئے — تارے نظر آنے کے ساتھ ساتھ اسے چاند اور سورج بھی نظر آ گئے تھے، ورنہ وہ کچھ تو حرکت کرتا — لیکن یوں لگتا تھا، جیسے حرکت کا اس کے جسم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو — ایسے میں فاروق کی آواز ہال میں گونجی:

"ارے ارے صاحب کیا ہو گیا ہے — اٹھیے نا — ابھی تو مقابلہ شروع ہوا ہے — ناراض تو نہ ہو جائیں ہم سے۔"

"بُری بات ہے فاروق — انہیں غصہ نہ دلاؤ — ورنہ یہ ابھی اٹھیں گے اور ہوٹل کے مالک کو پھاڑ کھائیں گے۔"

"لیکن ہوٹل کے مالک کو کیوں اور ہمیں کیوں نہیں؟"

"ہمیں اس لیے نہیں کہ ان بے چارے میں یہ طاقت ہی نہیں رہ گئی — ہاں جھلاہٹ کے انگارے چباتے ہوئے اپنے مالک کو ضرور کاٹ کھائیں گے یہ حضرت — کہ ایسوں سے کیوں لڑایا۔"

"جواب معقول ہے اور میں قائل ہو گیا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"ہائیں — تم مجھ سے قائل ہو گئے — بھئی اب شرمندہ نہ کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے — نہیں کرتا شرمندہ — اور تم ہوتے

ہی کیوں ہو شرمندہ — ہونے کے لیے اور بہت کچھ ہے —
مثلاً تابندہ — پایندہ — اور آیندہ۔"

"محمود! اب تم فاروق کی نقل اتارنے لگے — حالانکہ یہ وقت ہے — ہوٹل کے مالک سے دو دو باتیں کرنے اور شہر کا رُخ کرنے کا۔"

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا۔"

"یہ بھی بہت مصیبت ہے — ایک تم بات بے بات بات بھولتے بہت ہو۔"

"حد ہو گئی — لگا دیے باتوں کے ڈھیر — وہ بھی ایک جُھلے میں۔"

"تو یہ حد تو نہیں ہو گئی — یہ تو آرٹ ہو گیا ہے آرٹ — آرٹ جانتے ہو؟"

"تم میں کہیں فن — فاروق کی رُوح تو حلول نہیں کر گئی؟" فرزانہ بولی۔

"سامنے تو کھڑا ہے بے چارہ — اور اس کی رُوح بھی، بُرا مان جائیں گے دونوں۔"

"آپ اپنے پہلوان کو سنبھالیے جناب! ہم جا رہے ہیں — اور ہاں! پولیس نے ہمارا راستا روکنے کی کوشش کی تو پولیس سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"کیا کہا — پولیس سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"ہاں! اگر پولیس نے ہمارا راستا روکنے کی کوشش کی تو جو حشر ہم پولیس کا کریں گے — اس کے بعد دیکھے جانے کے لحاظ سے پولیس سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

"مان گئے بھئی تمھیں — اپنے بھلے دوست ثابت کرنے کے لیے چاہے تمھیں چیڑی اوٹی کا زور بھی لگانا پڑے — تو بھی نہیں چوکتے۔"

"کس کا زور لگانا پڑے؟"

"چیڑی اوٹی — اوہ نہیں — شاید کچھ اُلٹ پلٹ گئی ہے — ارے ہاں یاد آیا — ایڑی چوٹی کا — ویسے یار — یہ ایڑی چوٹی کا زور کس طرح لگایا جاتا ہے؟"

اسی وقت انھوں نے اور کئی پولیس کی گاڑیاں ہوٹل کے باہر رُکتے دیکھیں:

"ارے باپ رے — یہ تو بے شمار آ گئے — پہلے تو ہم نے انھیں آسانی سے گن لیا تھا — اب کس طرح گنیں گے؟"

"ذرا مشکل نہیں — پہلے ان کی کُل ٹانگوں کو گنیں گے، پھر چار پر تقسیم کر دیں گے۔"

"ارے باپ رے — انسادجہ کی پولیس چار ٹانگوں والی ہوتی ہے کیا؟"

"اوہ! میں بھول گیا — خیر — اگر چار پر تقسیم کر دیں گے تو پھر حاصل ہونے والے جواب کو دو سے ضرب دے دیں گے — اس طرح آنے والے کل پولیس والوں کی تعداد معلوم ہو جائے گی — رہ گئے جانے والے — میرا مطلب ہے — جو ہمارے ہاتھوں سے اوپر جائیں گے — انہیں بعد میں ہی گنا جائے گا — اور انہیں گننے کا طریقہ بھی آخر ڈھونڈ ہی لیں گے — جب نکلنے ہی ڈھونڈنے ہیں۔"

"مان گئی میں محمود تمہیں۔"

"حیرت ہے — تم تو ہمیشہ فاروق کو مانتی ہو — اور آج مجھے — ارے ارے — وہ آ گئے — آؤ چلو — اوپر۔"

تینوں نے اوپر کی طرف دوڑ لگا دی — ہال میں پولیس دھڑا دھڑ داخل ہو رہی تھی:

"کیا چکر ہے — ارے یہاں کیا ہو رہا ہے — یہ میرے انسپکٹر کیوں بے ہوش پڑے ہیں — جسے انہوں نے بے ہوش کیا ہے، میں اسے مبارک باد — اوہ میرا مطلب ہے — جس نے انہیں بے ہوش کیا ہے — میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں۔"

"سر — آپ بھول رہے ہیں۔" ایک پولیس آفیسر نے اس

بڑے آفیسر کو ٹوکا۔

"گگ — کیا بھول رہا ہوں۔"

"انسپکٹر صاحب کو بے ہوش کرنے والے کو آپ مبارک باد کس طرح دے سکتے ہیں — آپ تو اسے لٹکا دیں گے پھانسی پر۔"

"وہ میں بعد میں لٹکاؤں گا — پہلے تو اس کی تعریف کرنا ہو گی — اس قدر جری، دلیر، پھرتیلے، لڑاکے اور بھڑاکے پولیس انسپکٹر کو اس قدر آسانی سے کس طرح ڈھیر کر دیا اس نے، اس کی یہ تعریف کرنے کے بعد ہی میں اسے جیل بھجوا سکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جوتے کی ایک ٹھوکر انسپکٹر کی پسلیوں میں ماری — انسپکٹر نے اس طرح فوری طور پر آنکھیں کھول دیں، گویا بس ہوش میں آنے کے لیے اسی ٹھوکر کا تو انتظار کر رہا تھا — لیکن جونہی اس کی نظر اپنے آفیسر پر پڑی مارے خوف کے اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں:

"کوئی فائدہ نہیں جون — کوئی فائدہ نہیں — میں تمہیں جوش میں آتے — میرا مطلب ہے — ہوش میں آتے دیکھ چکا ہوں — اور میری نظر اس قدر کمزور نہیں کہ تمہیں ہوش میں آتے دیکھنے کے بعد بھی بھول جاؤں کہ — تم

ہوش میں آ چکے ہو۔ یا نہیں۔

"اس صورت میں سر۔ آپ کو اپنی نظر نہیں۔ یادداشت کہنا چاہیے تھا:" اسی ماتحت نے پھر ٹوکا۔

"چارلی۔ ایک تو تم ٹوکتے بہت ہو۔ اچھا انسپکٹر ہوش میں آئے بغیر بتا دو۔ یہاں کیا ہوا ہے؟"

انسپکٹر اسی طرح لیٹے لیٹے ساری کہانی سنانے لگا۔ پھر ہوٹل کے منیجر سے کہانی سنی گئی۔ اس کے بعد ہوٹل کے مالک سے اور گاہکوں سے ان باتوں کی تصدیق کی گئی۔ آخر آفیسر نے کہا:

"اس کا مطلب ہے۔ وہ تینوں انتہائی خطرناک ہیں۔ اور ہیں بھی غیر ملکی۔ لہٰذا ہم انھیں شوٹ تو کر نہیں سکتے۔ صرف گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں، عدالت میں جرم ثابت کرنے کے بعد پھر وہ مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہوں گے اور ہم اپنے دلوں کی بھڑاس خوب نکالیں گے۔ فی الحال وہ اوپر گئے ہیں۔ کیا وہ یہیں ٹھہرے ہوئے بھی ہیں؟"

"ہاں جناب۔"

"تب وہ اوپر اپنا سامان لینے گئے ہوں گے۔ تاکہ ہمارے ساتھ حوالات تک چل سکیں۔ ویسے اس ہوٹل سے باہر نکلنے کے اور بھی کئی راستے ہوں گے؟"

"راستے ضرور ہیں سر۔ لیکن ہر راستے پر ایک مسلح پہرے دار رہتا ہے۔" ہوٹل کے مالک نے بتایا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

"جی نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"لیکن میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔" پولیس آفیسر نے غرّا کر کہا۔

"کک۔ کون سی بات چیف؟" اس نے لرز کر کہا۔

"یہ کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ اور یہ بات چیف رونگ ثابت کر سکتا ہے۔"

"مطلب ہے۔ آپ غلط ثابت کر سکتے ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔ رونگ میرا نام ہے۔ ڈبلیو آر او این جی "رونگ" نہیں۔ آر او یو این جی "رونگ"۔ سمجھے تم؟"

"جج۔ بالکل سمجھ گیا سر۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو پھر بتاؤ۔ میں کیا کہنا چاہتا تھا؟"

"آپ۔ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔"

"اوہو۔ وہ تو چل ہی گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کس بنا پر میں نے یہ بات کہی تھی۔"

"م — میں نجومی نہیں ہوں سر۔"

"تم بے وقوف بھی ہو — اے میاں — جو لوگ یہاں اتنے لوگوں کو لمبا لٹا جائیں، وہ تمہارے ایک مسلح آدمی کو کب خاطر میں لائیں گے — مطلب یہ کہ کسی پہرے دار کو بے ہوش کرنے کے بعد وہ ہوٹل سے جا بھی چکے ہوں گے اور ہم یہاں کھڑے لکیر پیٹ رہے ہیں — لیکن اب انہیں یہاں تلاش تو کرنا ہوگا — چلو — پورے ہوٹل کو کھنگال ڈالو — تم میں سے جس نے انہیں تلاش کر لیا، اسے انعام بھی ملے گا۔"

اس کے ماتحت پورے ہوٹل میں پھیل گئے — انھوں نے ایک ایک کمرے کو چیک کیا — پھر دوسری طرف کھلنے والے ایک بڑے دروازے کے چوکیدار کو بے ہوش پا کر یہ اطلاع چیف رونگ کو دی —

"وہ چیف رونگ کو نہیں جانتے — اب میں کسی بھوت کی طرح ان کا پیچھا کروں گا — انسپکٹر صاحب — اگر آپ بے ہوش نہیں ہیں تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں — اور اگر بے ہوش ہیں تو پھر شوق سے یہاں آرام کر سکتے ہیں — لیکن پھر دو ہفتے تک ڈس مس۔"

ڈس مس کے الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر اس طرح اٹھا

جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو — اور شرما کر بولا:

"م — میں — بے ہوش ہو گیا تھا سر — لیکن اب بالکل ٹھیک ہوں — کہاں گئے وہ کم بخت۔"

"ایکٹنگ نہ کرو جی — دن رات فلموں میں ہم یہی تو دیکھتے رہتے ہیں۔" چیف نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ٹھیک ہے — اب کیا حکم ہے؟"

"پورے شہر کی ناکہ بندی کر دو — وہ شہر سے نکلنے نہ پائیں — تینوں حد درجے خطرناک ہیں — کہیں کوئی شدید نقصان نہ پہنچا دیں — شہر کو چار حصوں میں تقسیم کر لو — ایک حصے میں میں خود انہیں تلاش کرنے کے لیے نکل رہا ہوں — اس دعا کے ساتھ کہ — کاش انہیں میں ہی تلاش کر لوں۔"

"کیوں سر — آپ یہ دعا کیوں مانگ رہے ہیں؟"

"سیدھی سی بات ہے — اس صورت میں انعام میری جیب میں ہی رہ جائے گا۔"

"اوہ انعام۔"

اور پھر وہ پروگرام طے کرنے کے بعد نکل کھڑے ہوئے — چیف نے پورے شہر کی پولیس چوکیوں کو بھی خبردار کر دیا — اور جب تمام پولیس والے ہوٹل سے چلے

گئے تو محمود، فاروق اور فرزانہ اچانک پھر ہال میں داخل ہوتے نظر آئے —

انھیں دیکھ کر سب کا بُرا حال ہو گیا — یُوں لگتا تھا — کاٹو تو بدن میں لہو نہیں — آنکھیں پھاڑے وُہ انھیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وُہ اس دنیا کی نہیں، کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں — یا پھر جنّ بھوت ہوں۔

پولیس پورے ہوٹل میں انھیں تلاش کرتی رہی تھی اور تلاش کرنے کے سلسلے میں انھوں نے کوئی جلدی نہیں دکھائی تھی — نہایت اطمینان سے تلاشی لی گئی تھی، لیکن بے ہوش چوکیدار کو دیکھ کر انھوں نے فوراً یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ وہ اس طرف سے نکل گئے ہیں اور یہ نتیجہ نکال کر ہی انھوں نے غلطی کی تھی —

لہٰذا اب سب لوگ ان پر نظریں جمائے ہوئے تھے، ایسے میں محمود کی آواز گونجی —

بوڑھا

"آپ لوگ کس بات پر حیران ہیں — ذرا یہ تو بتا دیں؟"

"ہم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ ابھی تک ہوٹل میں ہیں۔" ہوٹل کے مالک نے کہا۔

"اب سوچ لیں — کوئی پابندی نہیں ہے سوچنے پر۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہو گیا؟"

"بہت آسانی سے — ایک دروازے کے چوکیدار کو بے ہوش کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے — اور ہم نہایت آسانی سے باہر بھی نکل جاتے — لیکن — باہر ہر چیک پوسٹ پر ہمیں دو چار آدمیوں کو بے ہوش کرنا پڑتا — اور ہم اتنے زیادہ آدمیوں کو بے ہوش کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں — لہٰذا ہم ہوٹل کی چھت پر چڑھ کر لیٹ گئے اور آرام کرتے رہے — تھک بہت گئے تھے نا — کب سے تو یہاں لگے ہوئے ہیں — اس سے پہلے ہی کون سا آرام کر رہے تھے،

آرام تو یُوں بھی ہماری قسمت میں نہیں ہے۔ ہمارے حصّے کا آرام شاید دُوسروں کے حصّے میں لکھ دیا گیا ہو گا۔ لیکن پھر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ۔ اس نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے۔ ہاں تو اب سارے شہر میں ہماری تلاش کی جائے گی اور ہم یہاں ہیں۔ ہے نا کمال۔"

"لیکن پولیس کو فون کرنا کیا مشکل ہے۔ ایک بار پھر پولیس یہاں آ جائے گی۔"

"ضرور کر دیں۔ ہم خود تنگ آ گئے ہیں۔"

"تنگ۔ لیکن کس بات سے؟"

"بس یہی میں خود سوچ رہا ہوں۔ کہ ہم کس بات سے تنگ آ گئے ہیں۔"

"حد ہو گئی۔" ہوٹل کے مالک نے جھلّا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"ارے باپ رے۔ محمود۔ تم اپنی جگہ پر تو موجود ہو نا۔" فارُوق بولا۔

محمود نے بوکھلا کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا:

"ہب۔ بالکل موجود ہوں۔ لیکن بات کیا ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ کہیں۔ تمہاری رُوح اس طرف تو نہیں آ گئی۔ ران پر ہاتھ مارا تھا انھوں نے۔"

"میرا خیال ہے۔ ہم ضرورت سے زیادہ وقت ضائع کر چکے ہیں۔ پولیس کا پارہ اب خوب چڑھ چکا ہو گا، کہیں وہ ہمیں ہلاک کرنے کے آرڈر حاصل نہ کر لیں۔"

"نہیں۔ یہاں کی پولیس۔ بلاوجہ کسی مجرم کو گولی نہیں مارتی۔ پہلے مقدمہ چلتا ہے۔ اس کے بعد سزا دی جاتی ہے۔"

"ہاں! یہاں یہ بہت آسانی ہے۔ اور اسی لیے تو ہم اس مُلک میں آئے ہیں۔"

"کیا مطلب۔ اگر یہ آسانی نہ ہوتی تو آپ لوگ یہاں نہ آتے۔"

"ہرگز نہیں۔ پھر ہم اس مُلک میں جاتے۔ جہاں یہ آسانی میسّر آتی ہو۔"

"جھوٹ بول رہے ہو دوستو۔"

"ن۔ نہیں۔ جھوٹ سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ اس معاملے میں انشادجہ کا جواب نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔

"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟"

"بس دیکھتے جائیں۔"

یہ کہہ کر محمود نے ایک بار پھر کچھ برتن گرا دیے۔

فاروق نے ایک آدمی کے سر پر ایش ٹرے پھینک ماری؛ فرزانہ نے ایک میز اُلٹ دی۔

"ارے ارے۔ یہ کیا۔ کیا پھر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے؟"

"نہیں۔ پاگل پن کے دورے کو واپس سمیٹ رہے ہیں۔"

"کیا کہا۔ پاگل پن کے دورے کو واپس سمیٹ رہے ہیں؟" کئی حیرت زدہ آوازیں اُبھریں۔

اور وہ ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں روکنے کی کسی نے کوشش نہ کی؛

"نکالنا یار فاروق۔ اپنے بیگ سے ایک بم۔ اس ہوٹل کے سامنے بم سے ایک گڑھا بھی بنا دیا جائے تو بہتر رہے گا۔"

فاروق نے ایک بم اسے دے دیا۔ اس نے اس کی پن کھینچی اور ہوٹل کے دروازے کے سامنے اچھال دیا۔ ساتھ ہی تینوں نے دوڑ لگا دی۔ بم کافی اونچائی تک گیا اور جب واپس آ کر زمین پر گرا۔ اس وقت تک محمود، فاروق اور فرزانہ کافی دُور جا چکے تھے۔ فوراً ہی خوفناک دھماکے کی آواز سنائی دی۔

"بس اتنا کافی ہے۔ اب پولیس سارے شہر میں ہماری

تلاش بند کر دے گی۔ ایک بار پھر وہ اسی سمت کا رُخ کرے گی۔ جب کہ ہم دوسرے حصے کا رخ کر رہے ہیں اور آزادانہ اپنی کارروائی عمل میں لا سکیں گے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔"

"کچھ دیر بعد وہ شہر کے ایک اور حصے کے ایک ہوٹل میں توڑ پھوڑ مچا رہے تھے۔ اور وہاں کے لوگ بھی اسی طرح پولیس کو جلدی جلدی اطلاع دے رہے تھے۔ اس وقت تک یوں بھی ان کا حلیہ ٹی وی پر نشر کر دیا گیا تھا۔ ان کی تلاش ہر طرف ہو رہی تھی۔ اور آخر اس ہوٹل کو گھیر لیا گیا۔ جلد ہی ان کی گرفتاری عمل میں آ گئی۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ پھر چیف کو اطلاع دی گئی۔ چند منٹ بعد چیف وہاں پہنچ گیا۔ ان پر نظریں پڑتے ہی اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور ایک ایک لفظ خوب چبا چبا کر بولا:

"ابھی۔ اور۔ اسی وقت میں تمہیں عدالت میں پیش کروں گا۔ عدالت کے جج کو چاہے گھر سے بلا کر کیوں نہ لانا پڑے۔"

"واہ۔ اس طرح تو ہماری شہرت دُور دُور تک پھیل

جائے گی۔"

"تمھاری شہرت کو دُور دُور تک ہی تو پہنچانا ہے، تاکہ جج شان دار سزا دے سکے۔"

"ارے باپ رے — آخر ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے مسٹر رونگ۔"

"اچھا! ابھی تم نے کچھ بگاڑا ہی نہیں — یہ بھی ایک ہی کہی — لے چلو بھئی — انھیں جج کہرام کی عدالت میں، میں وہیں جا رہا ہوں — اگر وہ عدالت میں نہ ہوئے تو میں انھیں گھر سے لے آؤں گا — اگر وہ گھر میں نہ ہوئے تو معلوم کر لوں گا کہ وہ کہاں ہیں — جج کہرام اس لیے زیادہ مناسب رہیں گے کہ وہ بہت سخت آدمی ہیں — نرم سزا سنانے کے عادی نہیں ہیں۔"

اور پھر انھیں عدالت میں لے جایا گیا — ان کی گرفتاری کی خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی — لہٰذا سارا شہر اس عدالت کی طرف اُمڈ آیا تھا — اَن گنت لوگ اس مقدمے کا فیصلہ سُننے کے لیے بے چین تھے —

جج واقعی عدالت میں نہیں تھا — وقت ختم ہونے کے بعد وہ جا چکا تھا — لیکن لوگ جانتے تھے کہ چیف اسے لے کر ہی آئے گا — اس لیے سب انتظار کر رہے تھے — آخر آدھ گھنٹے بعد جج اپنے چیمبر والے دروازے سے عدالت میں نمودار ہوا — سب لوگ اسے دیکھ کر اٹھ گئے — پھر اس کے بیٹھنے کے بعد ہی وہ بیٹھے — اس نے ایک تیز نظر ان تینوں پر ڈالی — اس فائل کا مطالعہ کیا — جو ان کے خلاف تیار کی گئی تھی — ان الزامات کو پڑھا، جو ان پر لگائے گئے تھے، پھر اس نے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا:

"کارروائی شروع کی جائے۔"

"شکریہ سر!" اس نے کہا اور ان کے خلاف جو الزامات تھے — پڑھ کر سنائے گئے — اس کے خاموش ہونے پر جج ان کی طرف مڑا:

"تمھارا کوئی وکیل ہے؟"

"ہم یہاں پردیسی ہیں سر — لہٰذا کوئی وکیل کیوں کر ہماری وکالت کے لیے تیار ہو سکتا تھا — اس لیے اپنی وکالت ہم خود کریں گے۔"

"اچھی بات ہے — آپ کے خلاف سرکاری وکیل نے جو الزامات لگائے — کیا وہ آپ کو منظور ہیں — اگر بحث وغیرہ اور گواہوں کے بغیر آپ لوگ ان الزامات کو مان

لیں گے تو میں نرم سزا دوں گا۔ اور اگر باقاعدہ عدالت میں مقدمہ چلا اور جرم ثابت ہو گیا تو پھر سزا بہت سخت ہو گی۔"

"ہم اپنی وکالت خود کریں گے۔"

"تو تمہیں یہ الزامات قبول نہیں؟"

"نہیں۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ تم نے یہ جرائم نہیں کیے؟" جج صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ..."

"اس لیے کہ کیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں عدالت میں نہیں چلیں گی۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ تم لوگ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بہت ماہر ہو۔" جج نے ناخوشگوار انداز میں کہا۔

"دیکھیے بڑے میاں۔ بات دراصل یہ ہے۔"

"خبردار! تم نے مجھے کیا کہا۔ بڑے میاں۔ اب تم پر توہینِ عدالت کا مقدمہ بھی چلے گا۔"

"ہم نے کچھ غلط نہیں کہا۔ آپ ہمیں بڑے میاں سے بھی پرلے درجے کی پرانی کوئی چیز لگتے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے آپ کو یہ پولیس چیف کسی قبر سے نکال

کر لے آئے ہوں۔"

"حد ہو گئی۔ ان کے بارے میں جیسا سنا تھا۔ یہ اس سے بڑھ کر نکلے۔ لیکن خیر۔ میرا نام بھی جج بیرون کہرام ہے۔"

"آپ جج بیرون ہوں یا اندرون۔ ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں آپ کو پڑ سکتا ہے، لیکن ہمیں اس سے کیا۔"

"جرم ثابت ہو گیا۔ یہ انتہائی خطرناک مجرم ہیں۔ ان سے ہمارے ملک کو شدید خطرہ ہے۔ یہ بموں کے دھماکے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ پولیس انسپکٹر تک کو بے ہوش کر ڈالتے ہیں۔ ہوٹلوں میں خطرناک قسم کی توڑ پھوڑ مچاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بے تحاشہ جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، لہٰذا انہیں خطرناک ترین مجرموں والی جیل میں رکھا جائے اور جیل میں بھی ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی نرمی نہ ہونے پائے۔"

"لیکن سر۔ آپ نے ہمیں صفائی کا موقع تو دیا ہی نہیں۔ ہم خود کو بے گناہ ثابت کر سکتے ہیں اور اگر ہم خود کو بے گناہ ثابت نہ کر سکے۔ تو آپ بے شک ہمیں پھانسی یا عمر قید کی سزا سنا دیجیے گا۔"

"اچھا یہ بات ہے۔ پھر سوچ لو۔ پھر میں عمر قید سے کم سزا نہیں سناؤں گا۔ اور اس صورت میں عمر قید والے قیدیوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔"

"ہمیں منظور ہے ینگ مین۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"شٹ اَپ۔ یہ عدالت ہے۔ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ کہ تمہارے منہ میں جو کچھ آتا جائے، تم کہتے جاؤ۔"

"اگر آپ کو ینگ مین نام پسند نہیں آتا تو ہم یہ واپس لے لیتے ہیں۔ آپ کو بڑے میاں کہتے ہیں تو آپ کو برا لگتا ہے۔ ینگ مین کہتے ہیں تو آپ کو برا لگتا ہے۔ آخر ہم آپ کو کیا کہہ کر پکاریں؟"

"صرف سر۔"

"بہت بہتر صرف سر صاحب۔ ہمیں منظور ہے۔ ہم نے اگر اپنی بے گناہی ثابت نہیں کی تو آپ جو چاہیں ہمیں سزا دیں۔"

"او کے۔ صفائی پیش کرو۔"

"ہم تو آج تمام دن آپ کے گھر میں چھپے رہے۔ آپ نے ہمیں پناہ دی ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم پر لگائے گئے تمام الزامات درست۔ میرا مطلب ہے، غلط ہیں۔"

"ہم۔ میں نے اپنے گھر میں تمہیں پناہ دے رکھی تھی؟"

"یس سر۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔"

"جرم ثابت ہو گیا۔ میرے گھر میں آج تمام دن تالا لگا رہا۔ اس لیے کہ میرے گھر والے اور میں اپنے رشتے داروں کے ہاں گئے ہوئے تھے اور اس بات کے گواہ پولیس چیف بھی ہیں۔ جب یہ اس مقدمے کے سلسلے میں مجھے بلانے میرے گھر آئے تو میرے پڑوسیوں نے انھیں بتایا کہ میں فلاں جگہ ملوں گا! چنانچہ مسٹر چیف وہاں پہنچے اور وہاں سے مجھے لے کر یہاں آئے۔ لہٰذا تمہارا بیان بالکل جھوٹا ہے۔ تم اپنے دعوے کے مطابق سخت سزا کے حق دار ہو۔ میں تمہیں عمر قید کی سزا دیتا ہوں اور خطرناک ترین قیدیوں کے ساتھ رکھنے کی سفارش کرتا ہوں۔"

"او کے سر۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے واقعی ان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ یہ اسی قابل تھے۔"

اور پولیس آفیسر انھیں لے کر باہر آ گیا۔

"کیا اب بھی کوئی چالاکی دکھانے کا ارادہ ہے؟"

"چاہیں تو دکھا سکتے ہیں۔" "لیکن اب کیا کریں گے دکھا کر۔" محمود نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔ میرا دعویٰ ہے۔ تم دکھا ہی نہیں سکتے۔"

"کاش! ہم دکھانے کے موڈ میں ہوتے۔" فاروق نے

سرد آہ بھری۔

"لیکن تم موڈ میں کیوں نہیں ہو — اب تمھیں کیا خطرہ ہے — سزا تو سُنا ہی دی گئی ہے — اس سے زیادہ تمھیں کیا سزا دی جا سکے گی بھلا۔"

"نہیں یار — بس اب دل نہیں کر رہا — ورنہ فرار ہونا تو ہمارے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" فاروق نے کہا۔

"تم نے مجھے کیا کہا — یار — تو میں تمھارا یار ہوں۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"اور سر — اس نے یہ بھی کہا ہے — فرار ہونا ان کے دائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

"ہاں تو کیا ہوا — بائیں ہاتھ کا تو نہیں کہا نا کہ تم بُرا ماننے کی کوئی کوشش کر سکو۔"

"اچھا بھائی — اب تو تم فرار ہو کر ہی دکھا دو — مان جائیں گے تمھیں۔"

"دیکھ لیں — کہیں آپ کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"نہیں پڑیں گے۔"

"اچھا تو پھر ذرا آنکھیں بند کریں۔" محمود بولا۔

"کیا کہا — آنکھیں بند کریں۔"

"ہاں ، جونہی آپ آنکھیں بند کریں گے — ہم غائب ہ

جائیں گے۔"

"ارے میاں جاؤ — کسی اور کو اُلّو بنانا — ہماری کھلی آنکھوں کے سامنے سے فرار ہو کر دکھاؤ۔"

"آؤ بھئی — ذرا انھیں نظارہ دکھا ہی دیں — فرزانہ — اب تمھاری باری ہے۔"

"جو حکم۔" فرزانہ نے کہا اور اپنے بالوں میں سے کلپ نکال کر اس کا بٹن دبا دیا — اچانک بہت تیزی سے سفید سی گیس چاروں طرف پھیل گئی — چیف اور اس کے ساتھی تڑا تڑ گرے اور بے ہوش ہو گئے — انھوں نے چیف کی پیٹی میں سے چابیاں نکالیں اور ہتھکڑیاں کھول ڈالیں، پھر وہ ہتھکڑیاں چیف اور اس کے دو ساتھیوں کو پہنا کر چابیاں دور پھینک دیں — اور خود وہاں سے پُرسکون انداز میں روانہ ہو گئے ، لیکن ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ انھیں گھیر لیا گیا — اب جو انھیں چیف کے سامنے پیش کیا گیا تو مارے شرم کے اس کا سر جھکا ہوا نظر آیا —

"اب آپ کو اتنا بھی شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"میں تم لوگوں کو مان گیا — آؤ اب تمھیں جیل تک

چھوڑ آؤں۔"

"لیکن آپ اتنے تھکے تھکے کیوں نظر آ رہے ہیں چیف صاحب؟"

"یار وہ — اوپر سے جھاڑ پڑی ہے کہ میں نے تم لوگوں کو فرار ہونے کا موقع کیوں دیا — یہ تو تم فوراً ہی پکڑے گئے، ورنہ نہ جانے افسرانِ بالا میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔"

"ہم جان بوجھ کر نہیں بھاگے تھے — ورنہ ہمیں پکڑا نہ جا سکتا — ابھی تک ہم خود اپنی مرضی سے ہی قابو میں آئے ہیں۔"

"لیکن کیوں — اگر تم فرار ہو سکتے تھے تو ہو کیوں نہیں گئے؟" اس نے کہا۔

"کچھ دن جیل میں آرام کرنا چاہتے ہیں — تھک گئے ہیں، اس قسم کی ہنگامہ آرائی کرکے۔"

"آخر تم اس قسم کے کام کیوں کرتے ہو — کس ملک سے تعلق ہے تمہارا؟"

"چھوڑیے — ان باتوں کو — ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

اور پھر وہ انہیں جیل کے دروازے پر جیل حکام کے حوالے کر کے رخصت ہو گئے — جیل حکام کو بھی ان کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا گیا — تاکہ وہ بھی ان کی طرف سے ہوشیار رہیں — جلد ہی انہیں جیل کے اندر پہنچا دیا گیا — وہاں ایک جدی صورت والے نے انہیں صبح، شام اور رات کے قواعد بتائے کہ کیا کچھ کرنا پڑتا ہے — وہ خاموشی سے سنتے رہے — آخر میں اس نے کہا:

"آخری بات — فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا — اگر کوشش کی اور پکڑے گئے تو سزا میں سات سال کا اضافہ ہو جائے گا — پھر کوشش کی تو مزید سات سال کا اضافہ ہو جائے گا — اسی طرح سزا کی مدت بڑھتی جائے گی اور فرار تم ہو نہیں سکو گے — اس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اطمینان اور سکون سے جیل میں اپنا کام کرتے رہو اور مدت پوری ہونے پر باعزت طریقے سے یہاں سے رخصت ہو جانا — تم اپنے ملک بھی جا سکو گے — حکومت تمہیں تمہارے ملک پہنچانے کا انتظام کر دے گی، لیکن اگر تم نے فرار ہونے کا کوئی چکر چلایا تو کسی قسم کی نرمی تم لوگوں سے نہیں کی جائے گی — سمجھ گئے؟"

"جی ہاں! بالکل" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"تو پھر جاؤ — نمبردار — انھیں ان کی کوٹھری دکھا دو تم لوگ دن کے اوقات میں جیل کے اندر اپنا کام کرکے گھوم پھر بھی سکتے ہو، لیکن رات ہونے سے پہلے اپنی کوٹھری میں پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"ہم ہر بات کا خیال رکھیں گے اور آپ کو جیل میں رہنے کے دوران کسی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیں گے۔"

"حیرت ہے — ہمیں تو تم لوگوں کے بارے میں بہت ڈرایا گیا تھا — کہ ایسے ہیں — ویسے ہیں — اور تم تو ایک دم شریف بچے نظر آتے ہو۔"

"ہم ایک دم شریف ہی ہیں اب آپ کو کیا بتائیں۔"

"خیر جانے دو — ہمیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

انھیں چکی چلانے اور کپڑے سینے کا کام دیا گیا۔ فرزانہ کو سلائی مشین پر لگایا گیا اور انھیں چکیوں پر بٹھایا گیا — یہاں انھیں آٹھ گھنٹے تک کام کرنا پڑا — آٹھ گھنٹے بعد پہلے کھانا دیا گیا — کھانا اچھا اور صاف ستھرا تھا — انھیں اپنے ملک کی جیلوں کے کھانے یاد آگئے اور وہ برے برے منہ بنانے لگے۔

"کیوں، کھانا اچھا نہیں لگا — فکر نہ کرو — آہستہ آہستہ

اچھا لگنے لگے گا۔" ایک بوڑھا قیدی بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں بڑے میاں۔"

کھانے کے بعد ان کو چھٹی تھی — وہ ادھر ادھر گھومنے لگے — گھومتے رہے — گھومتے رہے — ایسے میں ان کی نظریں ایک بوڑھے آدمی پر جم گئیں —

ان کے قدم اس کی طرف اٹھنے لگے —

ساحل پر

وہ بوڑھے کے نزدیک پہنچ کر رک گئے ، لیکن اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا— آخر محمود نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا :

"آپ کون ہیں بڑے میاں؟" اس نے اُردو میں کہا۔

"ہم — میں — پتا نہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔"

"کون سی بات کی طرف اشارہ ہے تمھارا میرے بچو۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"یہ کہ آپ کو پتا ہی نہیں — آپ کون ہیں۔"

"ہاں ! یہی بات ہے — میں نہیں جانتا ، میں کون ہوں۔" اس نے کہا۔

"خیر — آپ یہاں کس جرم میں قید ہیں؟"

"مجھے اپنے جرم کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں۔"

"اُف مالک ! یہ کیا چکر ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"تم کس چکر کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ کی سمجھ میں بھلا کیا آئے گا — جب آپ کو یہی معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں اور یہاں کس طرح پہنچے۔"

"تب پھر — کیا کیا جائے۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"آپ اس قید سے نکلنا پسند کریں گے؟"

"میں اگر نکل بھی جاؤں تو کروں گا کیا ، کہاں جاؤں گا — جب مجھے یہی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔"

"پہلے اتنا تو کرنے کو تیار ہو جائیں کہ ہمارے ساتھ اس منحوس جگہ سے نکل چلیے — پھر جو آپ کا جی چاہے ، کیجیے گا۔"

"اگر تم کہتے ہو تو میں ایسا کر لوں گا ، لیکن میں یہاں سے نکلوں گا کیسے؟"

"یہ کام ہمارا ہو گا — آپ کو یہاں سے نکالنے کا۔"

"تب پھر ٹھیک ہے — مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"چلیے — اپنی کوٹھری ہمیں دکھا دیجیے — ہم رات کو آئیں گے۔"

"لیکن تم آخر کس طرح کوٹھری سے نکل سکو گے اور

مجھے نکال سکو گے۔"

"یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ اور فکر نہ کریں۔"

"اچھی بات ہے۔"

اور پھر انھوں نے کوٹھری دیکھ لی۔ رات کو ایک بجے کے قریب، تینوں اپنی کوٹھری کی دو سلاخیں محمود کے چاقو سے کاٹ کر اس بوڑھے کے کوٹھری تک پہنچے۔ یہاں بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر چاروں جیل کی دیوار کے پاس آئے۔ محمود سب سے نیچے کھڑا ہوا، اس کے اوپر فاروق اور پھر فرزانہ۔

"اب آپ ہمارے اوپر چڑھ کر اس دیوار پر چڑھ جائیں۔" محمود نے سرگوشی کی۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"کیوں۔ ممکن کیوں نہیں۔"

"اوّل تو میں اس بچّے کے کندھے تک پہنچ نہیں سکوں گا۔ پہنچ بھی گیا تو اکیلا اس دیوار پر نہیں چڑھ سکوں گا۔ چڑھ بھی گیا تو دوسری طرف نہیں اتر سکوں گا۔ اور پھر تم لوگ کس طرح دیوار پر آؤ گے؟"

"اگر آپ سوالات کرنے کی بجائے۔ ہماری ہدایات پر عمل کریں تو یہ زیادہ بہتر رہے گا۔ ہم آپ کو گرنے

نہیں دیں گے۔ آپ چڑھ کر تو دیکھیں۔"

آخر وہ ڈرتے ڈرتے پہلے محمود کے کندھے پر چڑھا، پھر فاروق کے کندھے پر اور آخر میں فرزانہ کے کندھوں پر۔ اب منڈیر اس سے ذرا سی اونچی رہ گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ منڈیر پر جما دیے۔ اسی وقت سرچ لائٹ کی تیز روشنی ان سے ذرا اوپر سے گزر گئی:

"ارے باپ رے۔" محمود نے گھبرا کہا۔

"فکر نہ کرو، کام جاری رکھو۔ سر۔ آپ کو ذرا سی تکلیف کرنا ہو گی۔"

"اور وہ کیا؟"

"ہم میں سے صرف ایک کو بازو سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیں۔ باقی کام ہم کر لیں گے۔"

"اچھا!" اس نے کہا اور فرزانہ کو اوپر کھینچ لیا۔ اس کے بعد فرزانہ نے نیچے ہاتھ لٹکا دیا اور فاروق نے وہ ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہ دونوں لٹک گئے اور محمود کو اوپر کھینچ لیا۔ پھر اسی طرح انھوں نے پہلے دوسری طرف اس بوڑھے کو اتارا اور اس کے بعد خود باری باری اتر گئے۔ جب سب نیچے اتر گئے تو محمود نے دبی آواز میں کہا:

"دائیں طرف چلنا ہے۔"

وہ سب دائیں طرف چلنے لگے — پندرہ منٹ بعد انھیں سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی نظر آئی — کار کا دروازہ کھلا تھا — انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کار میں بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی کار چل پڑی — نہ انھوں نے کچھ کہا، نہ ان سے کچھ کہا گیا۔

ان کا یہ سفر قریباً تین گھنٹے جاری رہا — پھر ایک غیر آباد علاقے میں کار رک گئی — چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں اور کسی اور انسان کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا — اب کار کا ہارن تین بار بجایا گیا — فوراً ہی ٹارچ کی روشنی نظر آنے لگی — وہ اس سمت میں چلنے لگے جس طرف سے روشنی دکھائی گئی تھی — انھیں لمبے قد کا ایک آدمی سیاہ لباس میں کھڑا نظر آیا — جونہی وہ اس کے نزدیک پہنچے — وہ مڑا اور چلنے لگا — یہاں تک کہ وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔

"بہت خوب! تو تم انھیں لانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز گونجی۔

"ہاں! لیکن ان کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"وہ ان لوگوں نے ٹھیک کہاں رہنے دی ہو گی۔

یہاں لانے کے بعد پہلا کام یہی کیا ہو گا کہ ذہنی حالت خراب کر دی ہو گی۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی ہاں! یہ تو خود کو بھی نہیں پہچانتے۔"

"اوہ!" خان رحمان کی آواز سنائی دی۔

سیاہ پوش انھیں یہاں پہنچا کر اب غار کے منہ پر کھڑا ہو چکا تھا — غار میں روشنی کا انتظام تھا اور کھانے پینے کا بھی — اب وہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے، جسے وہ جیل سے نکال کر لاتے تھے —

"ان کا تو حلیہ بھی بہت حد تک تبدیل ہو چکا تھا، پھر تم نے انھیں پہچانا کیسے؟"

"ان کی عادات سے — حرکات سے — ہمیں بتایا گیا تھا، یہ انگلی سے یا تنکے سے کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کے عادی ہیں — یہ لوگ غالباً ان کی اس عادت کی طرف توجہ نہیں دے سکے، ورنہ شاید ہپناٹزم کے ذریعے عادت بھی چھڑا دیتے۔"

"ہوں خیر۔" پروفیسر داؤد نے کہا اور اس شخص کی طرف مڑے:

"آپ کو بھوک تو نہیں لگی ہوئی؟"

"بھوک — نن — نہیں تو — کھانا تو میں رات سونے

سے کافی دیر پہلے کہا چکا ہوں۔"

"تو آپ نہیں جانتے۔ آپ کون ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔

"آپ مجھے بھی نہیں پہچانتے۔ مجھے غور سے دیکھیں۔" پروفیسر بولے۔

اس شخص نے ان کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا، پھر نفی میں سر ہلا کر بولا:

"نہیں! میں آپ کو نہیں جانتا۔"

"اچھا۔ کمال ہے۔ حالانکہ آپ کو مجھے ضرور پہچان لینا چاہیے تھا۔ خیر آپ آرام کریں۔" انھوں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

ایسے میں سیاہ پوش نے منہ اندر کی طرف کر کے کہا:

"سر! میں کچھ گاڑیوں کو اس طرف آتے دیکھ رہا ہوں۔"

"کوئی پروا نہ کرو۔ اور مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ان تینوں کو وہاں مقرر کر دو۔ جہاں ہم نے ان کی جگہ طے کی تھی۔"

"او کے سر۔"

"یہ کون ہیں؟" فاروق نے پوچھا۔

"انشارجہ میں موجود خفیہ فورس میں سے ایک۔ یہاں

ان پہاڑیوں میں خفیہ فورس کے اور آدمی بھی موجود ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر اور بھی آ جائیں گے۔"

"لیکن جمشید! اگر ہم نے مقابلہ کیا تو انشارجہ بھی تو بے تحاشہ فوج یہاں لے آئے گا۔"

"اس وقت سے بہت پہلے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔ یوں بھی ہم ان سے لڑائی ضروری نہیں جانتے۔ یہ اگر ہم تک نہیں پہنچیں گے، یعنی ہمیں نہیں دیکھ پائیں گے تو ہم بھی خاموشی اختیار کریں گے۔"

"بہت خوب!" محمود نے کہا۔

اس شخص کو غار میں ہی چھوڑ کر وہ اپنی اپنی جگہوں پر جا چھپے۔ اب ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ سیاہ پوش ایسی جگہ تھا، جہاں سے اسے غار کا منہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دم سادھے لیٹے رہے۔ پھر پولیس کی گاڑیاں آ کر رک گئیں۔ ان میں سے بے شمار پولیس والے اترنے لگے۔ اور رائفلیں چھپائے اوپر کی طرف آنے لگے۔ وہ اگر چاہتے تو بہت آسانی سے ان کو نشانہ بنا سکتے تھے، لیکن وہ بلا وجہ انسانی خون بہانے کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔

سپاہی ادھر ادھر تلاش کرتے رہے، اچانک ان

میں ایک تیزی سے نیچے کی طرف جاتا نظر آیا:

"ہوشیار۔ اس نے کچھ محسوس کر لیا ہے۔" سیاہ پوش نے سرگوشی کی۔

"ہاں! شاید غار کا منہ دیکھ لیا گیا ہے۔ اب مقابلہ کرنا ہو گا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مقابلے کی صورت میں ان میں سے کوئی آدمی بچ کر نہ جانے پائے۔"

"اوکے سر۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔"

اور پھر نیچے سے اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ابھی تک حرکت میں نہیں آئے تھے۔ جب تک انسپکٹر جمشید کا حکم نہ ملتا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"شاید یہ ان کی چال ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ سپاہی جو اچانک نیچے کی طرف اپنے افسروں کے پاس گیا تھا۔ دراصل ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ ظاہر یہی کرنا چاہتا تھا کہ جیسے اس نے کچھ دیکھ لیا ہو۔ اور اسی لیے انھوں نے فائرنگ شروع کی ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وقت تک جوابی فائرنگ کر کے انھیں یہ بتا چکا ہوتا کہ وہ چھپا ہوا ہے۔ اور پھر ان کا کام آسان ہو جاتا۔ کیونکہ پھر ہیلی کاپٹر آتے اور ہم پر گولیاں برساتے، لیکن ہم اس وقت تک جوابی حملہ نہیں کریں گے۔ جب تک واقعی یہ ہمیں دیکھ نہ لیں اور حملہ کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت نہ رہے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے جمشید۔" خان رحمان بولے۔

"لیکن جمشید۔ آخر ہم اسی وقت یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کر سکتے؟"

"صبح سے پہلے ہم نہیں نکل سکیں گے۔ یہ رات ہمیں یہیں گزارنا ہو گی۔ کیونکہ ہمارے لیے جو لانچ آنا طے ہے۔ وہ صبح سویرے ہی ساحلِ سمندر پر پہنچے گی۔ اس سے پہلے نہیں۔ دراصل محمود، فاروق اور فرزانہ بہت جلد کامیاب ہو گئے۔ امید نہیں تھی کہ اس قدر کم وقت لگائیں گے۔ ہم تو اس خیال میں تھے کہ ابھی لانچ کے آنے کے بھی چند دن بعد کہیں ہم جا سکیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا خیر۔ یونہی سہی۔"

سپاہی جب فائرنگ کر کر کے تھک گئے اور جواب میں انھوں نے کسی فائر کی آواز نہ سنی تو انھوں نے

فائرنگ روک دی اور ایک آفیسر کی آواز سنائی دی:

"چلو بھئی۔ واپس۔ وہ لوگ یہاں نہیں ہیں۔"

"اگر وہ یہاں نہیں ہیں تو پھر ضرور اپنے ملک کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ اور ہمیں ان لوگوں کو سمندر میں تلاش کرنا ہو گا۔"

"بالکل ٹھیک۔" کسی اور نے کہا۔

"بڑا زبردست اندازہ لگایا انھوں نے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اور اس اندازے کی وجہ سے ہماری لانچ خطرے میں نہیں پڑ جائے گی؟" محمود نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"نہیں۔ وہ ساتھ میں آب دوز بھی ہے۔ سمندر کی تہ میں اتر سکتی ہے خطرے کے وقت۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن دشمن بھی تو تارپیڈو مار سکتا ہے۔"

"اس لانچ پر مقابلے کے انتظامات ہوں گے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

پہاڑیوں میں چکرانے والے سپاہی واپس جانے لگے۔ ان میں سے ایک آفیسر کی آواز سنائی دی:

"آؤ چلیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"ایک اور چال چلی ہے اس نے یہ کہ کر۔" انسپکٹر جمشید مسکرا اٹھے۔

"جی ہاں! ذرا بلند آواز میں یہ الفاظ کہے ہیں، تاکہ ہم اب سن لیں اور ان کے غائب ہو جانے کے بعد اپنی جگہوں سے نکل آئیں اور وہ چھپ کر دیکھ لیں۔"

"بالکل!"

"لیکن یہ اس چال میں بھی ناکام ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ!"

پولیس کی گاڑیاں چلی گئیں۔ وہ بہت دیر تک وہیں دبکے رہے۔ اور پھر انھوں نے کچھ سپاہیوں کو نہایت خاموشی سے اوپر آتے دیکھا۔

"دیکھا۔ انھیں اب تک یقین ہے کہ ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ اور یقین کیوں نہ ہو۔ ہمارے آسان فرار کا بھی ایک راستہ ہے۔ پہاڑ ہونے کی وجہ سے اس طرف فوج مقرر نہیں ہے، کیونکہ بہت کم لوگ ان پہاڑوں پر سفر کر کے سمندر تک پہنچنے کی جرأت کر سکتے ہیں اور پھر ساحل پر کون سا لوگوں کو لانچیں مل جاتی ہیں؛ تاہم ان کے بارے میں تو وہ اب تک اچھی طرح اندازہ لگا چکے ہوں گے۔"

"پہلے تو جمشید ان کی فکر کرو۔ وہ نزدیک آتے جا رہے ہیں۔"

"دیکھا جائے گا۔"

سپاہی ان کے بہت نزدیک آ گئے۔ اب تو انھیں اپنے سانس بھی روکنا پڑ گئے، لیکن سانس روکنے سے بھی کیا ہوتا۔ وہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ اب اگر وہ مڑ کر دیکھ لیتے۔ تو وہ انھیں نظر آ جاتے۔ اور مڑ کر انھیں بہرحال دیکھنا تھا؛ چنانچہ انھوں نے انھیں نشانے پر لیا اور فائر کر دیے۔ صرف چند منٹ میں میدان صاف تھا، لیکن یہ میدان صاف ہونا ان کے لیے اب خطرناک بن گیا تھا۔ ان لوگوں کا واپس نہ پہنچنا۔ ان کے آفیسرز کو چوکنا کرنے والا تھا اور یہاں بے شمار فوج آنے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ اور اب ان امکانات کو کم کرنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ جب کہ وہ چاہتے یہی تھے کہ انھیں جنگ نہ لڑنا پڑے۔

"مقابلے کی تیاری کر لو۔ اور ہیلی کاپٹروں کو نشانہ بنانے کا انتظام کر لو۔" انسپکٹر جمشید نے اعلان کیا۔

سیاہ لباس والا اپنے ساتھیوں کو فون پر ہدایات دینے

لگا۔ ایسے میں اچانک انھوں نے کئی ہیلی کاپٹروں کی تڑاتڑ سنی:

"بہت بڑے پیمانے پر حملہ کیا جانے والا ہے۔"

"ہیلی کاپٹروں کی فائرنگ سے بچنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم غار میں جا گھسیں۔" محمود نے فوراً کہا۔

"یہی تو وہ چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"ہاں! وہ چاہتے ہیں کہ ہم غار میں گھس جائیں اور وہ غار کے منہ پر جمع ہو جائیں۔ اور ہمیں گرفتاری دے دینے کے لیے کہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اب تو ہم چاہے مر جائیں۔ اس شخص کو ان کے حوالے نہیں کریں گے۔"

انھوں نے ہیلی کاپٹروں کا نشانہ لیا اور فائر کھول دیا، پہلے ہی ہلے میں دو ہیلی کاپٹر گرے اور باقی اونچی پرواز کر گئے۔

"اب یہ پھر آئیں گے۔ ان کا نشانہ لے لو۔" انسپکٹر جمشید نے چلا کر کہا۔

ہیلی کاپٹر پھر آئے۔ انھوں نے پھر پہلے کی طرح فائر کھول دیا۔ ادھر اوپر سے گولیوں کی تڑاتڑ شروع

ہو گئی۔

"اُف مالک! یہ تو ہزاروں گولیاں برسا رہے ہیں۔"

"لیکن اندھا دھند — انھیں یہ اندازہ نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔" انھوں نے کہا۔

"لیجیے — وہ بڑی فوج بھی آ گئی۔"

اب انھوں نے نیچے دیکھا — ان کے رنگ اڑ گئے — بے شمار فوجی گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔

"یہ اندازہ اب اس فوج کے ذریعے لگایا جائے گا کہ ہم کہاں ہیں۔"

"کیا اب بھی ہم ان کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا — ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر بڑے پیمانے پر یہ لوگ ہم پر حملہ آور ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں جمشید — ہم مقابلہ ضرور کریں گے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھ ہے۔" پروفیسر مسکرائے۔

"میری ایک تجویز ہے — اگر آپ مان لیں۔" ایسے میں فرزانہ کی آواز ابھری۔

"چلو بتاؤ۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"تجویز یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک ان صاحب کو لے کر لانچ تک پہنچنے کی کوشش کرے — باقی لوگ یہاں رہ کر دشمن کا مقابلہ کریں — زندگی ہوئی تو یہاں والے لانچ پر پہنچ جائیں گے — ورنہ یہ تو اپنے ملک پہنچ جائیں گے۔"

"ترکیب اچھی ہے — اس طرح ہم زیادہ بے فکر ہو کر دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔" خان رحمان نے کہا۔

"ایک تجویز میری بھی ہے سر — لیکن میں جانتا ہوں — آپ اس تجویز کو مانیں گے نہیں۔" سیاہ لباس والے نے کہا۔

"میں جانتا ہوں — تم کیا تجویز پیش کرنا چاہتے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر — ہمیں بھی سننے دیں نا — ان کی تجویز۔" فاروق نے کہا۔

"یہ کہنا چاہتے ہیں — ہم ان صاحب کو لے کر یہاں سے نکل جائیں — یہ لوگ دشمن کو روکیں گے — بھلا میں انھیں موت کے منہ میں چھوڑ کر کس طرح جا سکتا ہوں۔"

"ہاں بالکل! ہم آپ کو موت کے منہ میں چھوڑ

کر نہیں جا سکتے۔"

"لیکن ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اپنی ذات کے لیے نہیں کر رہے۔ اس وقت ضرورت ہے۔ انھیں بچانے کی۔ اور انھیں بچانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ سب انھیں لے کر چلے جائیں۔ یہاں رہیں گے تو انھیں صرف ایک آدمی لے کر جا سکے گا۔ راستے میں کوئی خطرہ درپیش آیا تو ایک آدمی دشمنوں سے کس طرح مقابلہ کر سکے گا۔ آپ سب تو مل کر بھی لیں گے۔"

"میرے خیال میں ان کی تجویز بہت مناسب ہے۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"تب پھر میری بھی ایک بات آپ لوگ مان لیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور وہ کیا؟"

"آپ سب چلیں۔ صرف میں ان کے ساتھ ٹھہروں گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔" سیاہ لباس والے نے کہا۔

"ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کو بھی موت کے منہ سے بچانا ہے۔"

"ہم ان کے پہلے حملے کو ضرور پسپا کر دیں گے۔ اس کے بعد اس سے بھی بڑا حملہ ہو گا۔ اس حملے سے پہلے ہم نکل جائیں گے۔"

"لیکن کس طرف سے۔ پہاڑیوں کو تینوں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔"

"تب ہم بھی سمندر کے راستے چلے چلتے ہیں، پھر اپنے طریقے سے انشارجہ میں داخل ہو جائیں گے۔"

"یہ سب سے زیادہ خوب صورت ترکیب ہے۔"

"تو پھر ہم اسی وقت ساحل تک پہنچنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے کئی گھنٹے تک تو پہاڑیوں میں سر ٹکراتے پھریں گے۔"

"بہت خوب!"

اسی وقت نیچے سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

"ایک بار بہت بھرپور انداز میں ان پر گولیاں برساؤ، اس طرح کہ ان کے زیادہ سے زیادہ آدمی مارے جائیں، تاکہ یہ آگے بڑھنے سے گھبراتے رہیں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملہ کرانے کا مشورہ دیں۔ اس طرح ہم نکل جائیں گے۔" خان رحمان بولے۔

"ٹھیک ہے۔ جانے سے پہلے میں ایک کام اور کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں چند گنیں نصب کر دو۔ ان کے

ٹریگروں سے ڈوریاں باندھ دو۔ ہم آگے بڑھتے جائیں گے اور ڈوریوں کو کھینچتے جائیں گے۔"

"ہاں! اس طرح بھی ہم انھیں کچھ دیر تک روکے رہیں گے۔"

آخر انھوں نے اس ترکیب پر عمل کیا۔ پہلے خوب موسلا دھار فائرنگ کی، لیکن اندھا دھند نہیں کی۔ تاک تاک کر، کی۔ اس طرح نیچے بے شمار چیخیں بلند ہوئیں اور اس طرف سے فائرنگ رک گئی، لیکن جلد ہی پھر شروع ہو گئی۔ ادھر انھوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی، پھر وہ وہاں سے سرکنے لگے۔ پہلے انھیں اوپر جانا تھا، پھر نیچے۔ ان کا یہ سفر کافی خطرناک تھا، لیکن وہ اس قسم کے سفروں کے عادی تھے۔ وقفے وقفے سے وہ ڈوریوں کو بھی کھینچ رہے تھے۔ اس طرح ان کے مورچوں کی طرف سے کچھ فائر ہو رہے تھے اور دشمن یہ خیال کرنے پر مجبور تھا کہ وہاں ان کے دشمن موجود ہیں۔ آخر وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب انھوں نے اترنا شروع کر دیا۔ ڈوریوں کو اس جگہ انھوں نے ٹریگروں میں سے نکال لیا۔ وہ ڈوریوں کو ٹریگروں میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، ورنہ اس طرح دشمن سیدھے ان کی سیدھ میں آتے۔

اپنے پیچھے وہ ابھی تک فائرنگ کی آوازیں سن رہے تھے۔ دشمن فوجی فوری طور پر تو اس جگہ پہنچ نہیں سکتے تھے، جہاں سے وہ فائرنگ کرتے رہے تھے، آخر کار وہ ساحل تک پہنچ گئے۔ لیکن ابھی تک لانچ نہیں پہنچی تھی۔ لانچ کو عین صبح سویرے پہنچنا تھا اور صبح سویرے تک انھیں وہاں انتظار کرنا تھا۔ وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے:

"کیا لانچ پر ہم اتنے بہت سے لوگ آ جائیں گے؟" خان رحمان نے سوال کیا۔

"ہاں! آ جائیں گے۔ وہ کوئی چھوٹی لانچ نہیں ہو گی اور پھر آگے چل کر ہمیں مدد بھی ملے گی۔ ایک جدید بحری جہاز اسلحے سے لیس ہو گا۔ بظاہر وہ مسافر بردار جہاز ہو گا۔ لیکن پوشیدہ طور پر اس پر اسلحہ موجود ہو گا۔ وہ ہمیں کسی بھی بحری حملے سے بچانے کے لیے کافی ہو گا۔"

"اور اگر لانچ کے آنے سے پہلے دشمن اس طرف آ گئے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"ہم تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ

کچھ نہیں ہیں۔ ہمارا کام صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اس سلسلے میں جو کام بھی ہمارے ذمے لگایا جائے۔ اس پر عمل کرنا ہماری ذمے داری ہے، اس کے بعد ہم کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس سے مومن کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کے لحاظ سے مومن کامیاب ہو یا ناکام۔ اللہ کے نزدیک وہ کامیاب ہی گنا جاتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مختصر سی تقریر جھاڑ دی۔

"بالکل ٹھیک جمشید۔ میں تمھارے ان خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔ ارے باپ رے۔" کہتے کہتے پروفیسر داؤد بوکھلا اٹھے۔

"خیر تو ہے انکل۔ یہ ارے باپ رے کہاں سے ٹپک پڑا۔"

"یار وہ۔ م۔ مجھے۔ بھوک لگ گئی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"رات کو اس وقت؟"

"وہ۔ بھاگ دوڑ کا کام کیا ہے نا۔"

"ہاں واقعی۔ یہ تو ہے۔ خیر۔ ہمارے پاس کچھ خشک خوراک ہے۔" محمود نے اپنے بیگ میں سے انھیں ایک پیکٹ دیا۔

"واہ۔ خوش کر دیا۔" وہ بچوں کی طرح چہکے۔

صبح ہونے تک وہ اللہ کا ذکر کرتے رہے۔ کچھ نے وضو کرکے تہجد کی نماز بھی ادا کی۔ آخر صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ اور ادھر انھیں لانچ آتی نظر آئی۔ مارے حیرت اور خوشی کے ان کے چہرے کھل اٹھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر پابندیٔ وقت کے ساتھ لانچ نظر آئے گی۔ لانچ ساحل کی طرف آنے لگی۔

"ہمیں ادھر ادھر چھپ جانا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"جب تک ہمیں پورا اطمینان نہیں ہو جاتا۔ ہم لانچ والوں کو نظر نہیں آئیں گے۔"

"واقعی احتیاط تو کرنی چاہیے۔"

وہ چٹانوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ نہ جانے کیوں ان کے دل دھک دھک کرنے لگے تھے۔ اگر وہ اس طرح نہ چھپتے تو شاید دل بھی نہ دھڑکتے۔

لانچ ساحل پر آ کر رک گئی۔ اس پر چند

آدمی کھڑے نظر آئے۔ انھوں نے ہاتھ ہلانے شروع کر دیے۔

"کیا خیال ہے جمشید؟"

"ابھی انھوں نے کوڈ جملہ نہیں کہا" وہ بولے۔

"ہوں۔ کیا ہاتھ ہلانے کی بجائے انہیں کوڈ جملہ کہنا تھا" خان رحمان بڑبڑائے۔

"ہاں! یہی بات ہے" انھوں نے فکرمندانہ انداز میں کہا، پیشانی پر بل بھی نظر آ رہے تھے۔

"کوئی گڑبڑ ہے کیا؟" خان رحمان بولے۔

"ایسا لگتا ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو"

یہ کہہ کر انھوں نے اُلّو کی آواز منہ سے نکالی۔ جواب میں انھیں کسی اُلّو کی آواز سنائی نہ دی۔

"نہیں بھئی۔ لانچ پر دشمنوں کا قبضہ ہے۔ اور ہمارے سامنے آتے ہی یہ لوگ ہمیں نشانہ بنا ڈالنے کا پروگرام رکھتے تھے۔ اچھا ہی ہوا۔ ہم پہلے ہی اوٹ میں ہو گئے"

"پھر۔ اب کیا کریں؟"

"بس دیکھتے رہو"

"لیکن اگر یہ بھی خطرہ محسوس کر کے واپس چلے گئے تو پھر ہم لانچ کس طرح حاصل کریں گے"

"تب پھر صرف میں ان کے سامنے جا رہا ہوں" انسپکٹر جمشید بولے۔

"نن۔ نہیں" محمود، فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ چلائے۔ لیکن وہ تو آگے بڑھ بھی چکے تھے۔

کہانی

"تو پھر ہم بھی آپ کے پیچھے آتے ہیں۔" پیچھے سے محمود نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" انھوں نے سرد آواز میں کہا۔

ان کے ہاتھ میں پستول بھی تھا — لانچ پر موجود لوگوں کی نظریں جونہی ان پر پڑیں — وہ حیران سے رہ گئے — پھر ان میں سے ایک نے کہا:

"آپ لوگ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں — لانچ پر آتے کیوں نہیں۔"

"میں آ رہا ہوں — میرے بعد باقی لوگ آئیں گے۔ پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ صحیح آدمی ہو یا غلط۔" انھوں نے کہا۔

"ضرور ضرور — آ کر اطمینان کر لیں، لیکن ذرا جلدی۔ وقت بہت نازک ہے۔"

"ہم جانتے ہیں — ہمارے پاس کتنا وقت ہے — اور کتنا نہیں۔"

وہ بے دھڑک آگے بڑھتے چلے گئے — یہاں تک کہ لانچ کے بالکل نزدیک پہنچ گئے —

"آپ لوگ بالکل درست آدمی ہیں۔"

"یس سر۔" ایک نے کہا۔

"میری خفیہ فورس کے آدمی ہیں۔"

"یس سر۔"

"تب میرا حکم مانو گے — اور میرا حکم یہ ہے کہ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے کہا ہے — ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"سوری سر! ہم یہ نہیں کر سکتے۔"

"کیوں — کیوں نہیں کر سکتے۔"

"ہو سکتا ہے — آپ نقلی انسپکٹر جمشید ہوں۔"

"تو پھر ایک ساتھی کو میرے پاس بھیج دو — مجھ پر گنیں تانے رہو — جب اس کا اطمینان ہو جائے گا — اس وقت میں تم لوگوں کو چیک کر لوں گا۔"

"ٹھیک ہے — تم جاؤ اور انھیں چیک کرو۔" ایک نے

دوسرے سے کہا۔

وہ لانچ سے اُتر کر ان کی طرف بڑھا۔ نزدیک آ کر ان کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا۔ پھر لانچ کی طرف منہ کر کے کہا:

"ان کے چہرے پر میک اپ وغیرہ نہیں ہے۔"

"بہت خوب! اب یہ لانچ پر آ سکتے ہیں۔"

"لانچ پر جانے سے پہلے میں اسے کیوں نہ چیک کر لوں۔" انسپکٹر جمشید نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ان کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ وہ گھبرا گیا۔

"یہ۔ یہ کیا؟" اس نے کانپ کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ صرف چیک کروں گا۔ اپنا نمبر بتاؤ؟"

"تیرہ۔"

"کوڈ بتاؤ؟"

"رات اندھیری ہے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے اپنے پستول کی نال اس کی کن پٹی پر رکھ دی۔

"تو تم نے لانچ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ میرے آدمیوں نے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

"وہ لانچ پر بندھے پڑے ہیں۔"

"آس پاس اور کتنی لانچیں یا جہاز موجود ہیں؟"

"ایک جنگی جہاز تم لوگوں کی خدمت کے لیے بالکل تیار ہے۔" اس نے نفرت زدہ انداز میں کہا۔

وہ سکتے میں آ گئے، پھر سنبھل کر بولے:

"اپنے ساتھیوں سے کہو۔ نیچے اُتر آئیں۔ ورنہ میں تمھاری کن پٹی میں تو گولی اتار ہی دوں گا۔"

"سب لوگ نیچے آ جائیں بھئی۔" اس نے کانپ کر کہا۔

"لیکن کیوں۔ ان لوگوں کو لانچ پر سوار ہونا ہے، ہم کیوں نیچے اُتریں۔"

"انھوں نے لانچ پر گڑبڑ بھانپ لی ہے۔ اور یہ مجھے گولی مار دیں گے۔"

"لیکن ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے نا۔ لہٰذا ہم جا رہے ہیں۔ نہ لانچ ہو گی، نہ یہ یہاں سے فرار ہو سکیں گے۔ اوپر سے ہماری فوج آ ہی جائے گی انھیں پکڑنے کے لیے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے دشمن کو ڈھال بنا کر ان پر فائرنگ کر دی۔ آن کی آن میں لانچ پر کھڑے ہوئے لوگ گر گئے اور تڑپنے لگے۔

"لانچ پر تمھارے کل کتنے ساتھی تھے؟"

"صرف پانچ۔"

"تب ان پانچوں کو گولی لگ چکی ہے۔ لیکن میں پھر بھی احتیاط کروں گا اور تمہیں ڈھال بنا کر لانچ پر جاؤں گا، تاکہ کوئی اور باقی نہ ہو۔"

اس کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ اسے لیے آگے بڑھنے لگے۔ ایسے میں پیچھے سے فاروق نے کہا:

"ہم بھی آئیں؟"

"ابھی نہیں۔" وہ سرد آواز میں بولے۔

لانچ پر پہنچ کر انھوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر بولے:

"میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھائے سامنے آ جاؤ۔ ورنہ تم صرف اپنے ساتھی پر گولی چلا سکو گے اور میں تم پر۔ اس طرح تم دونوں مارے جاؤ گے۔ دوسری صورت میں میں تم دونوں کو زندہ چھوڑ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے ایک منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔"

ایک منٹ سے بھی پہلے وہ ہاتھ اٹھائے سامنے آ گیا۔ اور پھر انسپکٹر جمشید نے اپنے باقی ساتھیوں کو لانچ پر بلا لیا۔ انھوں نے آ کر بندھے ہوئے خفیہ فورس کے آدمیوں کو کھول ڈالا۔

"اب بتاؤ۔ کیا واقعی سمندر میں جنگی جہاز موجود ہے؟"

"ہاں سر! یہ بات ٹھیک ہے۔" ان کے ماتحت نے کہا۔

"ہوں! خیر بھئی۔ تم دونوں اتر جاؤ۔ اور جہاں جانا چاہو، چلے جاؤ۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور لانچ سے اتر گئے۔

"صرف اتنا بتا دو۔ جہاز کس سمت میں ہے؟"

"سمت ہم کس طرح بتا سکتے ہیں۔ بظاہر تو یہاں سے دائیں طرف ہے۔ اس پر ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔"

"شکریہ!" وہ بولے۔

اب وہ لانچ پر روانہ ہوئے۔ انھوں نے جہاز کا مقابلہ کرنے کی پوری طرح تیاری شروع کر دی۔

"بائیں طرف دیکھ کر لانچ آگے لے جاؤ۔"

"تو ہم سمندر کے نیچے کیوں نہ سفر کریں۔"

"تارپیڈو مارے جائیں گے۔"

"لیکن ان سے بچنے کی بھرپور کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ہم جہاز کی زد میں تو نہیں آئیں گے نا۔" خان رحمان نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آخر تم بھی فوجی ماہر ہو۔ لانچ کو پانی کے نیچے لے چلو بھئی۔ اور اسی سمت میں رکھ کر سفر کرتے رہو۔"

"یس سر۔"

اب ان کا پانی کے نیچے سفر شروع ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید نے خفیہ جیب سے ایک ننھا سا مگر نہایت طاقت ور ٹرانسمیٹر نکالا۔ جلد ہی وہ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے:

"ہیلو۔ سی او۔ نائن۔ سی او نائن۔ سی او نائن۔"

"یس سر۔ ہم اس طرف موجود ہیں سر۔"

"سمندر میں ایک عدد دشمن بحری جہاز موجود ہے۔ جلد از جلد اسے اڑا دو۔ ورنہ وہ ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔"

"او کے سر۔ ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ جونہی ہمیں کامیابی ہوئی، آپ کو اطلاع دیں گے۔"

"ہاں! اس وقت ہم راستے سے ہٹ کر دائیں طرف سفر کر رہے ہیں، تاکہ اس کی زد میں نہ آ سکیں۔"

"ٹھیک ہے سر۔"

اور انھوں نے سیٹ بند کر دیا۔ لانچ پر ان کا

سفر جاری رہا۔ پھر اچانک ٹرانسمیٹر پر انھیں اشارہ موصول ہوا۔ سیٹ آن کر کے وہ بولے:

"یس۔ سی او نائن بات کر رہا ہوں۔"

"سر۔ خطرناک خبر ہے۔ ہم اس جہاز کو تباہ نہیں کر سکے۔ وہ پوری دنیا میں شاید سب سے زیادہ جدید ترین جہاز ہے، اس نے ہماری کئی لانچیں تباہ کر دی ہیں۔ اور اب وہ آپ کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کی رفتار دیکھ کر حیرت ہوئی ہے سر۔ لانچ سے بھی زیادہ رفتار ہے اس کی۔" دوسری طرف سے گھبرا کر کہا گیا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا، پھر وہ جلدی سے بولے:

"ہمارے کتنے آدمی مارے گئے ہوں گے؟" ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ فائرنگ سے پہلے ہی انھوں نے سمندر میں چھلانگیں لگا دی تھیں۔ کم از کم وہ دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ تو بنے نہیں۔"

"ہوں۔ اچھا۔ تم کہاں ہو اور کس طرح بچنے میں کامیاب ہوئے ہو؟"

"بس۔ اسے اللہ کی مہربانی ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری لانچ

بال بال بچی اور اب ہم جہاز سے بہت دُور آپ کے مخالف سمت میں موجود ہیں۔ جہاز کو چونکہ آپ کا رُخ کرنا تھا، اس لیے اس نے ہماری طرف خاص توجہ نہیں دی۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ اب تم اسی سمت میں آ جاؤ، لیکن جہاز سے فاصلے پر رہو۔ میرا خیال ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

"یس سر۔ آپ فکر نہ کریں۔" اس نے کہا اور انھوں نے سیٹ بند کر دیا۔

"ہمیں جہاز کا سامنا کرنا پڑے گا دوستو۔ جونہی جہاز نظر آنے لگا۔ ہم سمندر میں چھلانگیں لگا دیں گے۔"

"جو حکم۔" ایک خفیہ فورس والے نے کہا۔

وہ چلتے رہے۔ پھر انھیں اپنے راستے میں جہاز دکھائی دینے لگا۔ گویا وہ اس کا راستا کاٹ کر آگے نکلنے کی کوشش کرتے تو بھی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے تھے۔

"وہ۔ وہ گنوں کا رُخ ہماری طرف کر رہے ہیں۔ یہی وقت ہے۔ چھلانگیں لگانے کا۔"

انھوں نے پہلے ہی چھلانگیں لگانے کی تیاری کر لی تھی۔ اور ایک رسی کے ذریعے آپس میں خود کو باندھ

لیا تھا۔ تاکہ کوئی اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ تیرنا ان سبھی کو آتا تھا، یہاں تک کہ اس قیدی کو بھی تیرنا آتا تھا جسے وہ آزاد کرا کر لائے تھے۔ چھلانگیں لگاتے ہی وہ تیرنے لگے اور اس کے صرف ایک منٹ بعد ان کی لانچ کے پرخچے اڑ گئے۔ جونہی اس کے پرخچے اڑے، جہاز کا رُخ بدل گیا۔ اب وہ اس سمت میں جا رہا تھا۔ جس سمت سے وہ آئے تھے۔ گویا اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔

اب وہ اس سمت میں تیرنے لگے۔ جس سمت میں انھیں لانچ ملنے کی امید تھی۔

انھیں کئی گھنٹے تک سمندر میں تیرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ کی تو جان لبوں پر آنے لگی۔ پروفیسر داؤد کو انسپکٹر جمشید نے کندھے پر لادا اور خان رحمان نے اس قیدی کو۔ باقی ابھی کسی حد تک تیرنے کے قابل تھے۔ ایسے میں انھیں لانچ نظر آنے لگی۔ انھیں یوں لگا جیسے صحرا میں پانی نظر آ گیا ہو۔ ان کے چہرے کھل اُٹھے۔

اور پھر وہ لانچ پر سوار ہو گئے۔ ان سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب وہ نہایت تیزی سے اپنے ملک کا رُخ کر رہے تھے۔ بہت آگے چل کر ان کی

سمندری حدود میں کئی اور مدد گار لانچیں مل گئیں اور ان کا سفر اور آسان ہو گیا — آخر ایک دن وہ اپنے ملک کے ساحل پر اُترے — وہاں استقبال کے لیے بڑے بڑے آفیسر موجود تھے — ٹرانسمیٹر کے ذریعے انھوں نے اپنے پہنچنے کی خفیہ اطلاع انھیں دے دی تھی —

وہ سب ایک دوسرے کے گلے ملے اور ایوانِ صدر کی طرف روانہ ہوئے — وہاں پہنچ کر صدر کو ساری کہانی سنائی گئی ، پھر انسپکٹر جمشید نے کہا :

"اب فوری طور پر ضرورت ہے اس بات کی کہ ان کی دماغی حالت ٹھیک کی جائے ۔"

اسی وقت انھیں ماہرین کے حوالے کر دیا گیا — ماہرین کو ان کی دماغی حالت ٹھیک کرنے میں پندرہ دن لگ گئے — پندرہ دن بعد صدر صاحب نے انھیں بلایا — جب وہ وہاں پہنچے تو قیدی وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دل کش مسکراہٹ تھی —

"یہ ہیں وہ لوگ — جو آپ کو دشمن کی اس قدر کڑی قید سے نکال کر لائے ہیں — ہم نے ان کی عدم موجودگی میں آپ کی کہانی سننا پسند نہیں کیا تھا — اب آپ اپنی کہانی سنا سکتے ہیں — اتنا ہمیں معلوم ہے — کہ

آپ آج سے تین ماہ پہلے اپنے گھر سے یہ کہہ کر نکلے تھے کہ ایوانِ صدر جا رہے ہیں — انھیں ایک بہت اہم اطلاع دینا ہے ، لیکن آپ ایوانِ صدر نہیں پہنچے تھے — آپ غائب ہو گئے تھے — جلد ہی یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے — سارے ملک میں آپ کو تلاش کیا گیا ، لیکن آپ کا کوئی سراغ نہ ملا ، پھر انسپکٹر جمشید کو آپ کی تلاش پر لگایا گیا — انھوں نے آپ کی تلاش کے لیے جان توڑ کوششیں کیں اور آخر یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے — کہ آپ کو اغوا کر کے انشارجہ پہنچا دیا گیا ہے — یہ خبر ہم سب کے لیے از حد پریشان کن تھی — پھر یہ ذمے داری بھی انسپکٹر جمشید کو ہی سونپی گئی — کہ آپ کو ملک واپس لایا جائے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آخر انشارجہ جیسے ملک نے ہمارے ملک کے ایک آدمی کے اغوا کے لیے اس قدر پاپڑ کیوں بیلے — اب باقی کہانی آپ سنائیں گے — کیونکہ انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی آپ کو لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے — یہ تو آپ سن ہی چکے ہیں ۔" یہاں تک کہہ کر صدر صاحب خاموش ہو گئے۔

"ہاں ! میں سن چکا ہوں — اور جانتا ہوں — انھوں نے

میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ لوگ واقعی بہت عظیم ہیں۔ اللہ ہی انھیں اجر عطا فرمائے گا۔ میں آپ کو اپنی کہانی سُنا دیتا ہوں۔ آپ کو کہانی سُن کر کیا کرنا ہے۔ یہ آپ جانیں۔"

"ضرور ضرور۔" صدر صاحب بولے۔

اور وہ اپنی کہانی سنانے لگے۔ ان کی کہانی نے ان پر سکتہ طاری کر دیا۔ ان کے اوپر کے سانس اوپر نیچے کے نیچے رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

پروگرام ہے کیا

قیدی کی کہانی سُننے کے کافی دیر بعد تک گہرا سناٹا طاری رہا۔ وہ ایک دوسرے کو یوں ٹکر ٹکر دیکھتے رہے، جیسے انھیں کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔ آخر صدر صاحب نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا:

"اب جمشید۔ اب کیا کریں؟"

"ہم سب کو مل کر ہی سوچنا ہے کہ اب کیا کریں۔" وہ بولے۔

"پورے ملک کو اگر یہ خبر سُنا دی جائے تو ملک میں کھلبلی مچ جائے گی۔ آدھے لوگ تو یقین ہی نہیں کریں گے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے کو راز ہی رکھا جائے۔"

"یہی تو ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، بہت بہت خوفناک باتیں لوگوں سے چھپا لی جاتی ہیں، اگر

چھپائی نہ جائیں تو اس ملک کی حالت نہ بدل جائے۔"

"نہیں جمشید نہیں — ہم پوری قوم کو یہ بات نہیں بتا سکتے — اچھا سنو — میں نے سوچا ہے — یہاں ایک فوری اجلاس بلایا جائے — اس اجلاس میں خاص خاص لوگ موجود ہوں — ان سب کے سامنے یہ بات رکھی جائے اور مشترکہ فیصلہ مانگا جائے — کہ سب لوگ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے — لیکن اس کے انتظامات میں کروں گا — سارا پروگرام میں ترتیب دوں گا۔"

"کیوں نہیں — آپ تو اس کہانی کے ہیرو ہیں۔" قیدی نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں — ہیرو دراصل آپ ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اچھا جمشید — میں تم پر چھوڑتا ہوں — جو چاہو کرو۔"

"شکریہ سر!" وہ مسکرا دیے۔ ٭

پھر انسپکٹر جمشید اس اجلاس کے انتظامات میں مصروف ہو گئے — صدر صاحب کی طرف سے ان تمام لوگوں کو اطلاع دی گئی — پروگرام دوسرے روز رات نو بجے رکھا گیا تھا۔

ٹھیک نو بجے ایوانِ صدر میں وہ سب لوگ موجود تھے — ملک کے وزیرِ اعظم — تینوں افواج کے سینئر ترین آفیسرز جن میں کمانڈر انچیف سرِ فہرست تھے — پروفیسر داؤد اور خان رحمان تو پہلے سے ہی موجود رہے تھے — پولیس کے محکمے کے اعلیٰ ترین آفیسرز — اور دوسرے اہم ترین لوگ — لیکن ان سب کے چہروں پر ایک سوال تھا — آخر یہ اجلاس کس لیے بلایا گیا ہے — آخر کمانڈر انچیف سے رہا نہ گیا —

"صاحبِ صدر! یہ اجلاس کس سلسلے میں بلایا گیا ہے — ہم سب حیران ہیں — اور مارے سسپنس کے ہمارا برا حال ہے۔"

"ابھی آپ سب کے سامنے وضاحت کی جائے گی۔ مطمئن رہیے۔" صدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"کیا کسی اور کا انتظار ہے؟" وزیرِ اعظم بولے۔

"جی نہیں — بس انسپکٹر جمشید کے ذمے انتظامات لگائے گئے تھے — جونہی وہ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اب ہم اجلاس کی کارروائی کر سکتے ہیں — ہم پروگرام شروع کر دیں گے۔"

"لیکن پروگرام ہے کیا؟"

"یہی تو بتانا ہے — کہ پروگرام ہے کیا۔" صدر صاحب نے کہا۔

"جی — کیا مطلب؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ چند منٹ تک انتظار کریں۔"

آخر انسپکٹر جمشید ہال میں داخل ہوئے — ان کے چہرے پر گہرا سکون تھا — انھوں نے صدر صاحب کی طرف دیکھا، پھر بولے:

"اجازت ہے سر۔"

"ہاں جمشید ضرور۔"

"شکریہ سر" یہ کہہ کر وہ حاضرین کی طرف مڑے:

"آپ سب حضرات کو ایک اہم ترین مسئلے کے سلسلے میں زحمت دی گئی — یہ بات تو آپ کے علم میں ہو گی — کہ ہمارے ملک کی اٹامک انرجی کے انچارج — ملک کے مایہ ناز سائنس دان جناب عبدالقادر صاحب کو تین ماہ پہلے اغوا کر لیا گیا تھا — وہ اپنے گھر سے اپنی کار میں صدر صاحب سے ملاقات کے لیے نکلے تھے — گھر سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے گھر والوں کو بتایا تھا کہ وہ صدر صاحب کو ایک اہم بات بتانے جا رہے ہیں — وہ تین گھنٹے تک لوٹ آئیں گے لیکن چار گھنٹے گزرنے پر بھی جب وہ واپس نہ آئے تو ان کے گھر والوں نے ایوان صدر فون کیا، لیکن یہاں سے بتایا گیا کہ وہ تو وہاں پہنچے ہی نہیں تھے؛ چنانچہ پولیس کو خبردار کیا گیا — فوری طور پر ان کی تلاش شروع کی گئی اور جب اگلے چوبیس گھنٹے گزرنے تک وہ نہ ملے تو پھر اس تلاش کا دائرہ پورے ملک تک پھیلا دیا گیا، لیکن جب تین دن گزرنے پر بھی وہ نہ ملے تو اس کے بعد ان کی تلاش کا کام مجھے سونپا گیا — میں نے تفتیش شروع کی — اور تفتیش میں نے ان کے گھر سے شروع کی، کیونکہ وہ گھر سے یہ بتا کر روانہ ہوئے تھے کہ صدر صاحب کو ایک اہم ترین بات بتانے جا رہے ہیں — یہ بات انھوں نے اپنے گھر والوں کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں بتائی تھی، لیکن اغوا کرنے والوں کو پتا چل گیا تھا کہ وہ صدر صاحب کو کوئی اہم ترین بات بتانے جا رہے ہیں — لہٰذا صاف ظاہر ہے — اغوا کرنے والوں تک یہ بات ان کے گھر سے ہی جا سکتی تھی؛ چنانچہ میں ان کے گھر پہنچا — سب کو چیک کیا اور آخر ایک ملازم پر شک گزرا — ملازم اسی روز سے غائب تھا، جس روز سے عبدالقادر صاحب غائب تھے — اس ملازم کے گھر سے اور آس پاس سے اس کے بارے

میں معلومات حاصل کی گئیں، لیکن اس کا کوئی سُراغ نہ لگ سکا؛ تاہم میں نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ ان کی گم شدگی میں ہاتھ اسی ملازم کا ہے۔ لہٰذا میں نے ذرا وضاحت سے اس ملازم کا سُراغ لگانے کی کوشش کی۔ اس کے دوست احباب سے ملا۔ ایک دوست نے اتنا بتایا کہ آج کل وہ اتفاق ہوٹل میں بہت آتا جاتا ہے۔ ہم اتفاق ہوٹل پہنچے۔ چھان بین کی، لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ بہت باریک بینی سے جب کوشش کی تو صرف اتنا پتا چل سکا کہ کوئی غیر ملکی ہوٹل اتفاق میں اس سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔ یہ بات اہم تھی۔ ہم نے اس غیر ملکی کا حلیہ پوچھا۔ اور نوٹ کر لیا۔ اب میں نے خود کرنا شروع کیا کہ اس حلیے کا کون سا غیر ملکی ہمارے شہر میں موجود ہے۔ میں نے سفارت خانوں میں جا کر دوسرے ملکوں کے سفیروں سے ملاقاتیں کیں اور آخر ایک سفیر کا حلیہ اس حلیے سے مل گیا۔ میں ہوٹل کے اس آدمی کو اس سفارت خانے کے باہر لے گیا اور جب سفیر کسی کام سے باہر نکلا تو میں نے اس کا چہرہ ہوٹل کے ملازم کو دکھایا۔ اس نے فوراً تصدیق کر دی کہ وہ یہی تھا۔ اب میں نے اس سفیر کی تمام حرکات اور سکنات نوٹ کرنے کے لیے اپنے خاص آدمی اس کی نگرانی پر مقرر کر دیے۔ اس کا فون ٹیپ کر دیا گیا۔ اور دوسرے آلات اس کے دفتر میں لگا دیے گئے۔ اور آخر اس طرح ہمیں پتا چل گیا کہ ہمارے ملک کے مایہ ناز سائنس دان کو انشارجہ نے اغوا کرایا ہے۔"

"کیا!!" وہ سب ایک ساتھ چلائے۔

"ہاں! انشارجہ نے۔ اور یہ بھی پتا چل کہ انھیں اغوا کر کے لے جایا بھی انشارجہ ہی گیا ہے۔"

"اوہ۔ اوہ۔" سب چلا اُٹھے۔

ان کے چہروں پر حیرت کے بادل نظر آنے لگے۔

"پھر۔ آپ کے کیا کیا؟" کمانڈر انچیف بے چین ہو گئے۔

"ہاں! اس کے بعد میں نے کیا کیا۔ میں نے صدر صاحب سے ملاقات کی، انھیں سارے حالات بتائے۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں جاؤں اور اپنے سائنس دان کو انشارجہ کی قید سے نجات دلا کر واپس ملک لاؤں، تاکہ

وہ ملک کے لیے کام کر سکیں ، چنانچہ ہم انشارجہ پہنچ گئے۔ اپنے سائنس دان کا وہاں سراغ لگانا آسان کام نہیں تھا، ہم نے جان جوکھوں میں ڈال کر سراغ لگایا کہ انھیں جیل میں رکھا گیا ہے — لیکن ان کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے — ان کی برین واشنگ کر دی گئی ہے — خیر ہم نے کسی نہ کسی طرح جیل میں داخل ہو کر انھیں نکال لانے کا پروگرام ترتیب دیا — اور پروگرام میں محمود ، فاروق اور فرزانہ نے اہم کردار ادا کیا۔"

یہ کہنے کے بعد انھوں نے محمود ، فاروق اور فرزانہ کی کارروائیاں بھی سنا ڈالیں — ان کو سن کر اکثر چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں — لیکن صدر صاحب حد درجے سنجیدہ نظر آ رہے تھے — اس قدر سنجیدہ جیسے انھیں موت نظر آ گئی ہو —

"جیل سے نکال لانے کے بعد بھی ہماری مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں — انشارجہ کی حکومت ہمارے سائنس دان کے بارے میں بہت چوکنی تھی — لہٰذا بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ انھیں جیل سے نکال لیا گیا ہے ؛ چنانچہ پورے شہر میں ہماری تلاش شروع ہو گئی — اور آخر ہمیں پہاڑیوں میں گھیر لیا گیا — وہاں ہمیں کسی حد تک

ان کا مقابلہ بھی کرنا پڑا — لیکن ہم زیادہ دیر تک مقابلہ کرنے کی ہمت اور طاقت نہیں رکھتے تھے — لہٰذا نکل آنے کی کوشش کی — سمندر میں بھی ہمارے لیے مشکلات ہی مشکلات تھیں — وہاں بھی بحری جنگی جہاز ہمارے خاتمے کے لیے تیار تھا ، لیکن اللہ کی مہربانی سے ہم بچ نکلے۔ اور اس وقت یہاں موجود ہیں۔" انھوں نے ڈرامائی انداز میں کہا اور یک دم خاموش ہو گئے۔

"کیا مطلب — یہ کیا بات ہوئی ؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"کیوں — بات کیوں نہیں ہوئی ؟"

"عبدالقادر صاحب تو یہاں نظر ہی نہیں آ رہے ؟"

"وہ ابھی آپ کو یہاں نظر آئیں گے۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"آخر انشارجہ نے انھیں کیوں اغوا کیا تھا — وہ صدر صاحب کو کیا خاص بات بتانے کے لیے آ رہے تھے — یہ باتیں بھی تو آپ ہمیں بتائیں نا۔"

"یہ بات خود عبدالقادر صاحب ہم سب کو بتائیں گے کہ انھیں اغوا کیوں کیا گیا تھا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید نے سب پر ایک نظر ڈالی اور آخر محمود

سے بولے:

"جاؤ بھئی — انھیں لے آؤ۔"

وہ بغلی دروازے میں داخل ہو گیا — اور پھر قیدی کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا —

عبدالقادر صاحب کے چہرے پر حد درجے سنجیدگی تھی — موت کی سی سنجیدگی — اور پھر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے:

"ڈاکٹر صاحب — بتائیے — آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا — آپ صدر صاحب کو کیا بتانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تھے؟" کمانڈر انچیف بولے۔

انھوں نے سب کی طرف غور سے دیکھا، پھر صدر صاحب کی طرف مڑے:

"مجھے اجازت ہے سر؟"

"ہاں!" صدر صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ بہت ہی زیادہ دکھ بھری کہانی ہے — آپ لوگ شاید نہیں جانتے کہ اپنے ملک میں اٹامک انرجی سنٹر قائم کرنے کے لیے میں نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں — کس طرح یہ سنٹر بنایا — قابل لوگوں کو کس کس طرح اس میں جمع کیا — اور دن رات اس کے لیے کیا کیا کام کیا — یہ ایک بہت طویل

داستان ہے — جس کے سننے کا شاید آپ لوگوں کے پاس وقت بھی نہ ہو — مختصر یہ کہ آخر کار اللہ کی مہربانی سے ہم اپنے ملک میں اٹامک انرجی سنٹر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے — اور اس میں کام شروع کر دیا — لیکن جب سے ہم نے یہ سنٹر قائم کیا — اور اس میں کام شروع کیا — اس وقت سے غیر مسلم ممالک کے پیٹ میں بہت درد ہونے لگا ہے — خاص طور پر اشارجہ، بیگال اور شارجستان کے — یہ تینوں ملک تو خاص طور پر چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس سنٹر کو ختم کر دیا جائے — تباہ کر دیا جائے — اس سلسلے میں یہ تینوں برابر کوششیں کر رہے ہیں — بار بار سازشیں کی گئیں — منصوبے بنائے گئے — اس سنٹر کو اڑانے کے لیے ہمارے اسلحے کے ڈپو کو آگ تک لگائی گئی، تاکہ میزائلوں کی زد میں یہ اٹامک انرجی سنٹر بھی آ جائے، لیکن اللہ کو اس کی موجودگی منظور ہے شاید کہ ان کی یہ کوشش رائیگاں گئی — وہ ہر بار بُری طرح ناکام ہوئے — ان کی ناکامیوں میں انسپکٹر

جمشید کا بھی بہت ہاتھ ہے۔" یہ کہ کر وہ سانس لینے کے لیے رُکے اور انھوں نے انسپکٹر جمشید کی طرف مسکرا کر بھی دیکھا، پھر بولے:

"انھوں نے بیگال کی سازشوں کو ناکام کیا۔ اشارجہ اور شادجستان کی کوششوں کو ناکام بنایا — اور اس مرتبہ کی گھناؤنی سازش کو ناکام بنانے کا سہرا بھی آخر انھی کے سر رہا۔"

"سہرا!" محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے کھوئے کھوئے انداز میں نکلا۔

"ہاں سہرا — یہ اگر مجھے تلاش نہ کر لاتے تو بھی سنٹر ایک طرح سے ختم ہی ہو گیا تھا — اپنے بعد مجھے ایسا کوئی آدمی سوائے داؤد صاحب کے نظر نہیں آتا، جو اسے چلا سکتا — لیکن پروفیسر داؤد صاحب کا اپنا الگ میدان ہے، خیر — میرے نہ ہونے کی صورت میں شاید انھیں ہی سنبھالنا پڑتا — بہرحال دشمنوں نے وار تو خوب کیا۔"

"آخر وہ وار کیا تھا؟"

"وہی بتانے چلا ہوں — مجھے ایک روز رات کے وقت ایک فون ملا۔"

"فون — کس کا فون؟" وہ سب ایک ساتھ بولے۔

○

اے قوم

"جی ہاں فون: ہمارے مُلک کے وزیرِ اعظم صاحب کا فون۔"

"اوہ!" وہ بولے۔

"فون پر انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں فوراً ان سے ملوں — میں ان کے پاس پہنچا — انھوں نے مجھے بٹھایا اور ایک عجیب بات کہی — میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ عجیب بات کبھی نہیں سُنی ہو گی — اور شاید نہ آیندہ زندگی میں سنوں گا اور وہ بات یہ تھی کہ اٹامک انرجی سنٹر کو بند کر دیا جائے — میں یہ سُن کر دھک سے رہ گیا — میں نے ان سے کہا — سر! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں — آپ جانتے ہیں، اٹامک انرجی سنٹر کے بند کرنے کا مطلب — شادجستان ہمیشہ کے لیے ہمارے سر پر مسلط ہو جائے گا — اشارجہ تو پہلے ہی مسلط ہے — لیکن شادجستان تو عملی طور پر ہم پر قبضہ کرے

گا اور وہ قبضہ بنگال کی مدد سے کرے گا۔ ان لوگوں کو اگر خوف ہے تو ہمارے اٹامک انرجی سنٹر سے۔ میں نے یہ الفاظ تڑپ کر کہے۔ لیکن میرے الفاظ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولے۔ لیکن میں کیا کروں۔ انشارجہ نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو وہ میری حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔ میں حکومت کس طرح چھوڑ دوں۔ یہ سن کر میں نے کہا۔ آپ یہ بات اخبارات میں شائع کرا دیں۔ انھوں نے بھرپور انداز میں انکار کیا اور کہنے لگے۔ اس طرح تو میرا تختہ فوری طور پر الٹ دیا جائے گا۔ میں آپ کو حکم دیتا ہوں۔ سنٹر فوری طور پر بند کر دیا جائے۔"

"اوکے سر۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور گھر چلا گیا میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آخر میں نے صدر صاحب کو فون کیا اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا اور یہ بھی بتایا کہ بہت اہم کام ہے۔ انھوں نے اسی وقت بلا لیا اور میں گھر سے نکلا، لیکن میری کار کو بے کار کر کے مجھے اغوا کر لیا گیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا کچھ کیا گیا۔ کہاں کہاں رکھا گیا۔ غالباً وہ مجھے مسلسل

بے ہوش رکھتے تھے۔ اور میری برین واشنگ میں مصروف رہتے تھے۔ یہ ہے میری کہانی۔"

اتنا کہہ کر عبدالقادر صاحب خاموش ہو گئے۔ اب سب کی نظریں وزیر اعظم پر جمی تھیں۔

"یہ بات بالکل غلط ہے۔ الزام ہے۔ میرے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ اور یہ سازش عبدالقادر اور انسپکٹر جمشید نے مل کر ترتیب دی ہے۔" وہ بولے۔

"ہم جانتے تھے۔ آپ کا جواب یہی ہوگا، لیکن سر شاید آپ ایک بات نہیں جانتے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اور وہ کیا؟"

"یہ کہ۔ میں کبھی کوئی کچا کام نہیں کرتا۔ فاروق اسے لے آؤ۔"

جلد ہی فاروق گیا اور ایک شخص کو لیے اندر داخل ہوا، سب کی نظریں اس پر جم گئیں:

"یہ کون ہے؟" وزیراعظم نے منہ بنایا۔

"عبدالقادر صاحب کے گھر کا ملازم۔ جو ان کے اغوا کیے جانے کے ساتھ ہی غائب ہو گیا تھا، لیکن میں نے اسے بھی ڈھونڈ نکالا تھا۔ اسی نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ ڈاکٹر صاحب صدر صاحب سے ملنے جا رہے

ہیں اور آپ نے یا آپ کے کسی کارکن نے اسے اس لیے اس گھر میں داخل کر دیا تھا، تاکہ آپ کو اس قسم کی اطلاعات مل سکیں۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"جی ہاں! اس ملازم کا بیان یہی ہے۔ کہ اسی نے وزیرِاعظم کو یہ خبر سنا کر ہوشیار کیا تھا کہ عبدالقادر صاحب صدر صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔ آپ کے ہاں سے آتے ہی۔ صدر صاحب سے ملاقات بلا وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آپ جان گئے کہ ڈاکٹر صاحب کیا بتانے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انھیں فوری طور پر آپ نے راستے میں سے ہی غائب کروا دیا اور پھر انشارجہ بھجوا دیا۔ آپ مُلک کے وزیرِاعظم ہیں۔ آپ کے لیے بھلا یہ کام کرانا کیا مشکل تھا۔ اور انشارجہ ایسے آدمی کو بھلا کیوں نہ قبول کرتا۔ بس یہ ہے کُل کہانی۔ اب آپ جانیں۔ آپ لوگوں کا کام جانے۔" انھوں نے کہا، پھر جلدی سے بولے:

"خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ وزیرِاعظم صاحب اگر اب بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ ہم ان کی بات سننے کے لیے

تیار ہیں۔"

"یہ میرے خلاف سازش ہے۔ میں تو یہی کہوں گا۔"

"تب آپ عدالت میں اس سازش کو ثابت کر دیں، آپ کو اجازت ہو گی۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"کیا مطلب؟" وزیرِاعظم نے چونک کر کہا۔

"مطلب یہ کہ اب آپ اپنے عہدے سے استعفیٰ لکھ دیں۔ یہی آپ کے حق میں بہتر رہے گا۔"

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں مُلک میں عام انتخابات کے ذریعے وزیرِاعظم بنا ہوں۔ عوام کا منتخب کردہ وزیرِاعظم ہوں۔"

"ہاں! لیکن آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ملک اور قوم کا سودا کر ڈالیں۔ اٹامک انرجی پلانٹ بند کرانے کا آپ کیا حق رکھتے ہیں۔ آپ ہمارے ملک کے وزیرِاعظم ہیں، انشارجہ کے مُلازم نہیں ہیں۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"میں اپنی کابینہ سے مشورہ کر کے فیصلہ کروں گا۔"

"نہیں۔ یہ فیصلہ آپ کو ابھی کرنا ہو گا۔" کمانڈر انچیف نے کہا۔

"افسوس! میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"اس صورت میں آپ کو حراست میں لیا جا سکتا ہے۔"

"کیا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اور آپ پر ڈاکٹر عبدالقادر صاحب کے اغوا کا مقدمہ چل سکتا ہے۔"

"آپ ہوش میں تو ہیں۔ کس سے بات کر رہے ہیں؟" وزیرِاعظم نے کہا۔

"اپنے ملک کے وزیرِاعظم سے۔ جس نے ہمارے ملک کے ایک اہم ترین آدمی کو اغوا کرا کے انشارجہ پہنچا دیا، جہاں ان کی برین واشنگ کی گئی۔ اور انھیں بے چارگی میں مبتلا کرنے کا سبب بنے۔ اور یہ سب انھوں نے صرف اس لیے کیا کہ وہ اس ملک کے وزیرِاعظم رہ سکیں۔ انھیں تو انشارجہ کو یہ جواب دینا چاہیے تھا کہ میری وزارت رہے یا نہ رہے۔ میں اٹامک انرجی سنٹر بند نہیں کروں گا۔ اس میں کام جاری رہے گا۔" کمانڈر انچیف نے کہا۔

وزیرِاعظم کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ ان کا سر جھک گیا۔ کتنی ہی دیر وہ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ آخر بولے:

"مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ واقعی میں نے بہت بڑی غلطی کی۔ آئندہ میں ایسی کوئی غلطی نہیں

کروں گا۔ انشارجہ کیا۔ اس کا باپ بھی کہے۔ میں دباؤ میں نہیں آؤں گا۔ مجھے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔"

"نہیں۔ اب آپ کو موقع نہیں دیا جا سکتا۔ آپ کے لیے صرف اور صرف ایک ہی راستا ہے۔ اور وہ یہ کہ آپ استعفیٰ لکھ دیں۔ ورنہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا اور آپ پر مقدمہ چلے گا۔ یہ مقدمہ انسپکٹر جمشید عدالت میں لڑیں گے اور اپنے خاص انداز میں ثبوت پیش کریں گے۔ پھر یہ بات پوری دنیا میں پھیلے گی۔ اگر آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

"ن۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

وہ چلائے اور پھر انھوں نے استعفیٰ لکھ دیا۔

"آپ وزیرِاعظم ہاؤس خالی کر کے اپنے گھر چلے جائیں۔ ملک میں نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔"

ان کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ اٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔ کوئی ان کے ساتھ باہر نہ گیا۔ کسی نے ان کے لیے ادب آداب کا کوئی طریقہ اختیار نہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد کمانڈر انچیف بولے:

"آپ ملک میں صدر راج نافذ کر دیں — اور نئے انتخابات کا اعلان کر دیں۔"

"لیکن سر — کیا نئے انتخابات ہمارے ملک کا حل ہیں — انتخابات تو نہ جانے کتنی مرتبہ ہو چکے ہیں — یہ مغربی جمہوریت ہے — جو ان لوگوں نے صرف ہمارے ملک پر لاگو رکھی ہے — خود انشارجہ میں اس قسم کی جمہوریت نہیں ہے — آخر کیوں — انشارجہ میں انتخابات اس طرح کیوں نہیں ہوتے جس طرح وہ ہمارے ہاں کرانا پسند کرتا ہے — وہ اپنے ہاں اس طرح انتخابات کیوں نہیں کراتا — یا وہ ہمارے ہاں اس طرح انتخابات کرائے، جس طرح اپنے ہاں کراتا ہے — کبھی اے مسلم قوم — اس بات پر غور کیا — جی نہیں — ہم نے غور کی عادت ترک کر دی ہے — ہمیں انشارجہ کی طرف سے جو اشارہ مل گیا، سو مل گیا — اسی پر عمل ہوتا ہے — اس کے سوا ہمیں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔" انسپکٹر جمشید جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے —

ایوانِ صدر میں گہرا سکوت طاری ہو گیا — آخر صدر صاحب بولے:

"یہ انسپکٹر جمشید نے بالکل نیا نقطہ اٹھایا ہے — ہم

اس پر ضرور غور کریں گے — میرا اپنا بھی خیال ہے کہ مغربی طرز کی یہ جمہوریت ہمارے ملک میں نہیں چل سکتی — بلکہ انسپکٹر جمشید کے مطابق تو یہ مغربی جمہوریت بھی نہیں ہے — یہ تو ان لوگوں نے ہمارے سروں پر مسلط کر رکھی ہے — خود اس سے بے نیاز ہیں — انشارجہ میں ملک کے صدر کا جب انتخاب ہوتا ہے نا — تو پوری قوم مل کر اس انتخاب میں حصّہ لیتی ہے — صدارت کے لیے جتنے امیدوار کھڑے ہوتے ہیں، سب لوگ انھیں ووٹ ڈالتے ہیں اور اس طرح صدر منتخب ہو جاتا ہے — آخر ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا — اس پر ضرور غور کیا جائے گا — بہرحال ہم سب انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کو سلام کرتے ہیں۔" صدر صاحب کا ہاتھ سلام کے انداز میں اٹھ گیا۔

اور پھر وہاں موجود سب لوگ واقعتاً سلام کے انداز میں ان کے لیے کھڑے ہو گئے اور ان کے ہاتھ پیشانیوں تک اٹھ گئے —

"ارے ارے — یہ آپ کیا کر رہے ہیں — نن — نہیں — نہیں — خدا کے لیے — ایسا نہ کریں۔"

انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا اور پھر انھوں نے بوکھلاہٹ

کے عالم میں باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ان کے ساتھیوں
نے بھی ان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔
انھوں نے اپنے پیچھے ہنسنے کی آوازیں سنیں۔